آمنہ مفتی کے ناولوں کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

تنزیلہ اشرف

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

آمنہ مفتی کے ناولوں کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

تنزیلہ اشرف

یہ مقالہ

ایم فل اُردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: آمنہ مفتی کے ناولوں کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ

پیش کار: تنزیلہ اشرف، رجسٹریشن نمبر: 1581/M/U/F18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر ظفر احمد ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ ____________

اقرار نامہ

میں تنزیلہ اشرف حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

تنزیلہ اشرف

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

ABSTRACT

Title: An Ecocriticism study of Amna Mufti's Novels

Amna Mufti holds a prominent position in the genre of Urdu literature. She has made a name for herself in literary circles in a very short period, as a play writer, novelist, columinist and teacher.

The concept of Ecocriticism is incepted with the evolution of Urdu literature. Though this concept was never given any priority at the earlier stages, however, several scholars have been pondering upon the philosophy of ecocriticism. Therefore, this study defines and justifies the concept of ecocriticism and its evolution throughout the historical timeline. Moreover, this study aimed at looking at the content of the novels in order to determine the contextualization of the work, done by Amna Mufti. In this regard, this study will employ the content analysis research tool, which shall regulate the qualitative connotation of the content.

The chapterization of the research has been designed in the following manner:

- The first chapter of this study critically discusses the overall profile of Amna Mufti and her contribution to Urdu literature.
- The second chapter is focused upon Amna Mufti's work under the ecocriticism philosophical concept. The literature, written by Amna Mufti includes her two novels; Jurat e Randaana and Akhri Zamana.
- In the third chapter, the study elaborates Amna Mufti's 3^{rd} novel Pani Mar Raha Hai. The discussion on the said topic is followed by an arrangement, to which the Ecocriticism elements in the novel, have been treated.

- In the forth chapter, the study discusses Eco feminism vis-à-vis Amna Mufti's literary work. The the 1st part of the chapter, the relationship between Ecocriticism and feminism is to be discussed. The study contends that Ecofeminism is a branch of feminism on the one hand and Ecocriticism on the other.

The entire discussion of the above mentioned four chapters is to be a conclusion with the conclusion section, which shall sum up the entire core literature.

اظہار تشکر

اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے میں اپنے ایم فل کے مقالے بعنوان "آمنہ مفتی کے ناولوں کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ" کے تکمیل کے مراحل تک پہنچ سکی ہوں اس کے لیے میں اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہی ہے کیونکہ یہ وہی وہ ذات باری تعالیٰ ہے جس کی عطا کردہ ہمت اور مہیا کیے گئے اسباب کی بدولت ہی میں اس مقالے کو مکمل کر سکی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس کی رحمت کی بدولت مجھ ناچیز نے اپنا ایم۔فل کا یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے حضور سجدہ شکر بجالانے کے بعد جو ہستیاں سب سے زیادہ شکریے کی حق دار ہیں وہ میرے والدین ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف میرے تعلیمی اخراجات پورے کیے بلکہ مجھے ہر ممکن طریقے سے ایسا تعلیمی ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی جس میں میں با آسانی اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھ سکوں اور اپنے تحقیقی کام کو مکمل کر سکوں۔ میں ان کی شفقت اور محبت کی بھرپور طریقے سے شکر گزار ہوں۔ اس کے ساتھ میں اپنے بھائی کی بھی بے حد ممنون ہوں۔ جو ہر قدم پہ میری راہنمائی کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے پھر چاہے وہ کتابوں تک رسائی ہو یا کمپوزنگ کے مسائل ہوں کیونکہ کویڈ-19 کی وجہ سے تحقیقی کام کے سلسلے میں بے حد مسائل کا سامنا تھا۔ان تمام مسائل سے نبرد آزما ہونے میں میرے بھائی میرے شانہ بشانہ موجود رہے۔ان کے ساتھ میری بھابھی بھی ہر ممکن طریقے سے میری مدد کے لیے موجود ہوتی تھیں میں ان کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

روحانی والدین یعنی اساتذہ کرام جن کا درجہ والدین سے بھی بڑھ کر ہے۔اس حوالے سے میرے تمام اساتذہ کرام جنہوں نے بچپن سے لے کر اب تک مجھے ایک حرف بھی سکھایا، سمجھایا، ان سب کے سکھائے گئے علم کی بدولت ہی میں آج اس مقام تک پہنچ سکی ہوں۔ ان سب ہستیوں کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ صدر شعبہ اردو نمل پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ لودھی کی بے حد مشکور ہوں ان کے ساتھ ساتھ نمل کے تمام اساتذہ کرام (ڈاکٹر عابد حسین سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر رخشندہ مراد، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر ارشاد بیگم، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر عنبرین شاکر جان، ڈاکٹر نازیہ ملک، ڈاکٹر بشریٰ پروین، پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز) کی بے شکر گزار ہوں۔ جن کی وقتاً فوقتاً کی جانے والی رہنمائی کی بدولت مجھے ہمت اور حوصلہ ملتا رہا جو میرے تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کار گر ثابت

ہوا۔ ان کا مشفقانہ رویہ سکالرز کو اپنا کام مکمل کرنے کا حوصلہ دیتا ہے اور ان سب کا یہ ہی رویہ میرے تعلیمی سفر میں میرے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوا۔

میرے نگران مقالہ ڈاکٹر ظفر احمد کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ جن کی رہنمائی اور اپنا قیمتی وقت دینے کی وجہ سے ہی میں اپنا کام بر وقت کر سکی ہوں۔ ان کی مدد اور تعاون کے بنا یہ ناممکن کام تھا۔ مجھے جس لمحے میں بھی ان کی ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ میری تحقیقی رہنمائی اور مدد کے لیے ہمہ وقت موجود رہے۔ ان کی شفقت اور حوصلہ افزائی نے مجھے اپنا تحقیقی کام احسن طریقے سے مکمل کرنے کی طرف مائل کیے رکھا۔

اپنے مقالے کے تکمیل کے سلسلے میں میں جن کی ممنون ہوں ان میں میرے ہم جماعت جویریہ کہکشاں، فاروق کلیار، اعجاز رازق کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے میرے تحقیقی سفر میں میری گاہے بگاہے حوصلہ افزائی بھی کی اور مواد کی جمع آوری ہو یا تکنیکی مسائل ان میں بھی میری مدد کی۔

ان تمام ہستیوں کے علاوہ میں صاحب موضوع "آمنہ مفتی" کے تعاون اور رہنمائی کا بے حد شکر ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے ایک ہی فون کال پہ بہت زیادہ خلوص اور اپنائیت کے ساتھ میرے تحقیقی کام کے حوالے سے جو بھی مواد و معلومات چاہیئے تھیں مجھے نہ صرف ارسال کر دیں بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کرتی رہیں۔ میں اپنے تحقیقی کام میں مدد اور رہنمائی کرنے والی شخصیات کے تعاون کی بے حد شکر گزار ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام ہستیوں کو دنیا اور آخرت کے ہر میدان میں سرخرو کرے۔ آمین!

تنزیلہ اشرف

سکالر ایم۔ فِل اُردو

باب اول :

موضوع تحقیق کا تعارف، بنیادی مباحث، آمنہ مفتی کی سوانح و شخصیت

الف۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف:

ادبی حلقوں میں آمنہ مفتی کا نام بطور ناول نگار، ڈراما نگار، کالم نگار اور شاعرہ کے حوالے سے معروف ہے۔ چونکہ اوائل عمری سے ہی لکھنے پڑھنے کی طرف رجحان تھا، اس لیے آٹھ سال کی عمر میں ہی ایک غزل کے ذریعے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ جس میں ان کے استاد شہرت بخاری تھے مگر انہوں نے جب اپنی شاعری کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی سے رائے طلب کی تو انہوں نے ان کی شاعری کو رد کرتے ہوئے ان کو ناول نگاری کا مشورہ دیا اور یوں ان کی پہلی مختصر کہانی "پھر وہی دشت" 1998ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ سلسلہ آگے چل کر ناول نگاری کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ ان کی جملہ تحریروں کے مطالعے کے بعد وضاحت ہو جاتی ہے کہ انھوں نے نئے، منفرد اور اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھانے کی سعی کی ہے۔ بعینہ ان کے ناولوں میں بھی دور حاضر کے ایک اہم مسئلے یعنی ماحول اور اس کو درپیش خطرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو ناول نگاری کی روایت میں خصوصاً اس موضوع کو بنیاد بنانے کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بنیادی طور پر مملکت خداداد پاکستان ایک زرعی ملک ہے، جس کو قدرت نے اپنے بیش بہا خزانوں سے نواز رکھا ہے۔ مگر یہاں بدقسمتی سے ان قدرتی وسائل کی اہمیت سے آگاہ کرنے نیز ان کا بے دریغ استعمال روکنے اور ان کی حفاظت کرنے کے حوالے سے کوئی جامع اور دیرپا منصوبہ بندی کی گئی اور نہ ہی دیگر موجود قوانین پر پوری طرح عمل درآمد ہوا۔ یہ امر بھی طے ہے کہ اس نوع کی کاوشیں اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں جب تک کہ عوامی شعور کو اس مسئلے کی نزاکت کا احساس نہ دلایا جائے۔ مغرب میں صنعتی انقلاب کے بعد دانشوروں کی توجہ اس مسئلے کی جانب مبذول ہو گئی تھی۔ لہذا وہاں علوم و فنون کے ساتھ ادب و فلسفے میں بھی اس حساس موضوع پر قابل ذکر کام ملتا ہے۔ آمنہ مفتی نے پہلی بار اس موضوع پر مسلسل توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ان کے تینوں ناولوں، خاص طور پر ناول "پانی مر رہا ہے" کا بنیادی موضوع ماحول اور اس کو درپیش خطرات ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ:

عالمی ماحولیاتی بحران کے نتیجے میں ماحولیاتی موضوعات کو اب اہمیت و اولیت حاصل ہو گئی ہے۔ اسی سبب ماحولیاتی تنقید بھی ایک جدید صنف ادب کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس بین الشعبہ جاتی صنف میں کسی ادبی فن پارے میں بیان کردہ فطرت اور ماحول کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ متن میں قدرت و ماحولیاتی عناصر کو مصنف نے کس طور برتا ہے، نیز اس کے کم و کیف کیا ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آمنہ مفتی کی تحریروں میں نئے موضوعات خصوصاً ماحولیاتی مسائل کی مناسب نمائندگی موجود ہے۔ اس تحقیق میں ان کے ناولوں کا ماحولیاتی تنقید کے پیمانوں کے تحت تجزیہ کیا گیا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق:

1۔ ماحولیاتی تنقید کا بطور موضوع تعارف نیز اس کی ضرورت و اہمیت بیان کر کے اردو ادب میں اس کے فروغ کی کوشش کرنا

2۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی عناصر کی نشاندہی کرنا

3۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں فطرتی اور ماحولیاتی عناصر کی موجودگی اور ان کو برتنے کی وجوہات جاننا

۴۔ تحقیقی سوالات:

1۔ ماحولیاتی تنقید کے خدوخال کیا ہیں؟

2۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی تنقیدی عناصر کی صورتحال کیا ہے؟

3۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی تنقید کے عناصر کے کم و کیف کیا ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

گزشتہ چند دہائیوں سے دنیا کی مکمل تباہی جس کا حوالہ کئی مذہبی صحائف میں بھی موجود ہے، کا ذکر شدومد سے ہونے لگا ہے۔ اس تباہی کے پس پردہ موجود محرکات میں سب سے اہم ماحول کی تباہی ہے۔ یعنی انسان دراصل قدرتی ماحول کو خراب کر کے خود اپنے ہاتھوں دنیا کو تباہی و بربادی کی جانب دھکیل رہا

ہے۔ دوسری جانب اس المیے کی نشاندہی و تدارک کے لیے بھی انسان ہی مصروف عمل ہے۔ ان کی پہلی ترجیح یقیناً دوسروں کو بھی قدرتی ماحول کی ضرورت واہمیت سے روشناس کرانا ہے۔

اور اسی سلسلے کی ایک کڑی آمنہ مفتی کی افسانوی و غیر افسانوی تحاریر ہیں جن میں قدرتی و ماحولیاتی موضوعات کا ذکر صراحت سے ملتا ہے۔ اور مجوزہ تحقیقی مقالے میں ان کے ناولوں کا ماحولیاتی تنقیدی نظریات کے تناظر میں تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ ماحولیاتی تنقید فطرت اور ثقافت کے درمیان رابطے اور خاص طور پر ادب اور زبان کے ثقافت کے افعال و کردار کو موضوع بناتی ہے۔ اگر تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک طرف سے زمین سے جڑی ہے تو دوسری طرف سے ادب کے ساتھ اس کا رشتہ منسلک ہے۔

مختصر اور سادہ ترین الفاظ میں ماحولیاتی تنقید ادب اور قدرتی ماحول کے درمیان رشتوں کے مطالعے کا نام ہے۔ اس کا آغاز 1960ء کی دہائی سے ہو گیا تھا۔ مگر اسے اپنے معاصر تنقیدی کلامیوں کے برعکس ادبی فورم میں اپنا مقام بنانے میں کافی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا مگر 1990ء تک اس نے ایک مضبوط و مستحکم دبستان کا روپ اپنا ہی لیا اور امریکہ ، برطانیہ ، یورپ سے ہوتا ہوا اردو ادب میں بھی نمایاں اور اہم موضوع کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے اور زیر نظر مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے جس میں ماحولیاتی تنقید کے آغاز سے اردو ادب تک کے سفر ، ماحولیاتی تنقید کے عناصر اور ماحولیاتی تنقید کی شاخ ایکو فیمنزم کو شامل تحقیق رکھتے ہوئے "ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی ترجمہ شدہ کتاب "ماحولیاتی تنقید نظریہ اور عمل (منتخب مضامین) "اور "نسترن احسن فتیحی کی کتاب ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ "سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق کا موضوع آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی تنقید ہے۔ لہذا موضوع کو مد نظر رکھتے ہوئے آمنہ مفتی کے تین ناولوں 'جرات رندانہ '، 'آخری زمانہ ' اور 'پانی مر رہا ہے ' کو بنیادی ماخذات کی حیثیت حاصل ہے۔ ان ناولوں کا مطالعہ ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ماحولیاتی تنقید کے موضوع پر موجود اُردو نیز چند بنیادی انگریزی کتب کو بھی بنیادی ماخذ کے طور پر ہی شمار کیا گیا ہے۔ تجزیاتی و متنی تحقیق کے ساتھ تنقیدی تحقیقی طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول نگاری کی روایت، اسلوب وغیرہ جیسے عمومی مباحث کے لیے ثانوی ماخذات سے بھی بھرپور استفادے کی کوشش کی گئی ہے۔ناول نگار اوران کے قریبی رفقاء کے علاوہ عہد حاضر کے اہم ناقدین سے رابطہ کرکے ان کے نقطہ ہائے نظر جاننے کی کوشش کی گئی تاکہ مصنف کی شخصیت و افکار اور موضوع سے متعلق کماحقہ آگہی حاصل ہو سکیں۔ بنیادی و ثانوی ماخذات کے علاوہ مزید کتب کے لیے جامعاتی، سرکاری اور نجی کتب خانوں کے علاوہ آن لائن مواد سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

آمنہ مفتی کا شمار اُردو ادب کے نمایاں لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ان کے فن و فکر اور ادبی خدمات کے حوالے سے ممتاز ناقدین اظہار وخیال کرتے رہتے ہیں۔ان کی ناول نگاری پر نامور اہل قلم کے تبصرے تو ملتے ہیں مگر اس موضوع پر تاحال کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ البتہ نمل سے ایم۔فل اردو کی ایک اسکالر "عاطف علیم کے ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ" کے عنوان سے مقالہ رقم کر رہے ہیں۔ جس کا ایک ذیلی عنوان ماحولیاتی تنقید بھی ہے۔

علاوہ ازیں تین پاکستانی جامعات میں آمنہ مفتی کی افسانوی و غیر افسانوی نثر پر ایم فل سطح کی تحقیق ہو رہی ہے۔

۸۔ تحدید:

مجوزہ تحقیق آمنہ مفتی کے ناول میں ماحولیاتی تنقید کے مطالعے پر مشتمل ہے۔اس میں ان کے تین ناول جرات رندانہ، آخری زمانہ اور پانی مر رہا ہے شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کی دیگر تحاریر،ڈرامے کہانیاں اور کالم وغیرہ مقالے کی تحقیقی حدود میں شامل نہیں ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور پر ناول نگاری اور ماحولیاتی تنقید پر تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔اور اس کے علاوہ آمنہ مفتی کے ناولوں اور ماحولیاتی تنقید پر لکھے گئے تنقیدی مضامین، تبصروں اور تجزیوں کو بھی تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

آمنہ مفتی کی تحاریر نے ناول نگاری کے اندر نئے اور اچھوتے موضوعات کو متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے ناول آخری زمانہ کے حوالے سے عبد اللہ حسین نے کچھ یوں کہا ہے کہ "مجھے آمنہ مفتی کا "آخری زمانہ" واقعی پسند آیا اور میں چاہوں گا کہ ہر شخص اس کو پڑھے۔" تاہم آمنہ مفتی کے ڈرامے ناولوں کی نسبت زیادہ مقبول ہوئے۔حالانکہ ان کے ناول، موضوعات خصوصاً ماحولیاتی موضوع کے علاوہ فنی و فکری اعتبار سے زیادہ گہرائی و گیرائی کے حامل ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ آمنہ مفتی کی ناول نگاری کے مختلف جہات پر تحقیق و تنقید خاص طور پر جامعاتی سطح پر کی جائے۔زیر نظر مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ب۔بنیادی مباحث:ماحولیاتی تنقید:

i۔ماحولیاتی تنقید(Eco Criticism)آغاز وارتقاء:

ہمارے ارد گرد جو بھی جاندار یا بے جان چیزیں(انسان ،حیوان ،پیڑ پودے،زمین،ہوا،سورج، پانی)موجود ہیں۔ان کو ماحول(Environment)کا نام دیا گیا ہے۔جو قدرتی ہیں۔لیکن ہمارا ماحولیاتی نظام(Eco-system)دو قسم کے عناصر(قدرتی اور مصنوعی) سے مل کر بنتا ہے اور ان سب کے آپسی رشتے کے مطالعے کو ماحولیات(ecology) کہا جاتا ہے۔جو حیاتیات کی ایک شاخ ہے۔

> "ایکولوجی یونانی الاصل لفظ ہے۔یہ لفظ مرکب ہے دو لفظوں کا یعنی (Oikos) جس کے معنی ہیں "گھر" اور(logos) جس کے معنی ہیں "مطالعہ" چنانچہ(Ecology) کہتے ہیں۔(Organism) یعنی حیات (خواہ حیوان ہوں یا نباتات)کا اپنے ماحول سے باہمی تعلق کا مطالعہ "[1]

موجودہ دور میں اس لفظ کو کائنات کی بنت اور اس کے عملی نظام کے مطالعہ کے معانی میں استعمال کرتے ہیں۔

"ماحول کے لیے انگریزی زبان میں (Environment) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ قدیم فرانسیسی زبان کے لفظ (Environner) سے انگریزی زبان میں آیا ہے۔ جس کے معنیٰ (گھیرنا) کے ہیں۔ یہ اکثر زبانوں میں ایک جدید اصطلاح ہے۔ اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جرمنی زبان میں (umwelt)، ہندی زبان میں (paryavaran)، ہسپانوی زبان میں (Medio ambiente)، جاپانی زبان میں (kankyo) اور عربی زبان میں (البئیۃ) استعمال ہوتا ہے۔" [۲]

ماحولیات کے لفظ کو اگر مختلف لغات میں دیکھتے ہیں تو اس کے معانی کچھ یوں ہیں۔

"فرہنگ تلفظ" میں ماحولیات کے معانی کچھ یوں درج ہیں۔ ماحولیات: "زمین کے آس پاس کی ہوا نیز روئے زمین کا بقائے انواع کے نقطہ نظر سے مطالعہ "[3] ماحولیات نظام، آزاد دائرہ المعارف، ویکیپیڈیا میں ماحولیات کی تعریف کچھ اس انداز سے کی گئی ہے۔

"ماحولیات حیاتیات کی ایک شاخ ہے۔ جس میں جانداروں کا ایک دوسرے اور ماحول کے مابین تفاعل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اصطلاحات "ایکولوجی (Ecology)" اور اینوائرونمنٹ (Environment) کا ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے"[۴]

سائنسی و فنی ڈکشنری میں ماحولیات (ecology) کے معنی کچھ یوں درج ہیں:

Ecology:۔ "ماحولیات (eco مکان، جائے سکونت) زندہ اشیاء کا مطالعہ، ان کے گرد و پیش کے حالات کے تعلق سے، مثال کے طور پر اس سوال کا جواب کہ بعض اقسام کے پودے صرف بعض مخصوص مقامات پر کیوں پیدا ہوتے ہیں۔" [۵]

پینگوئن ڈکشنری آف سائنس (2009ء) کے مطابق ایکولوجی (ماحولیات) کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"ایکولوجی سے مراد جانداروں کا ایسا مطالعہ ہے۔ جو ارد گرد کے ماحول (اور اس ماحول میں موجود دیگر جانداروں) سے ان کے تعلق کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا جائے۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی کی قومی انگریزی اردولغت(1994ء) کے دوسرے ایڈیشن میں ماحولیات (ecology)کے معنی کچھ اس طرح درج کیے گئے ہیں:

"Ecology"حیاتیات کی ایک شاخ جس میں اجسام نامی اور ان کے ذی روح اور غیر ذی روح مجموعی ماحول کے مابین روابط کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔: عمرانیات کی شاخ جس کا تعلق انسانی آبادیوں،ان کے ماحول، مکانی تقسیم اور ان سے جنم لینے والے ثقافتی نمونوں سے ہے؛ماحولیات۔"

اکثر لوگ(Ecology) ماحولیات اور (Environment) ماحول کو ایک دوسرے کے ہم معانی یعنی مترادف ہی گردانتے ہیں۔ مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم معانی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ (Ecology)میں حیات و کائنات کے عناصر سے استفادہ کی کیفیات جبکہ (Environment)میں جتنے بھی جاندار پائے جاتے ہیں ان کا آپسی اور ان کے ماحول کے ساتھ جو رشتہ ہے اس کے بارے میں بات کی جاتی ہے یعنی اس میں ماحولیات پر جو عوامل اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں ان کو کس طرح قابو میں رکھتے ہوئے ان کے مضر اثرات سے ماحول کو کیسے بچانا ہے اور ان تمام کا مطالعہ شامل ہے۔

اس طرح اگر ماحولیاتی تنقید کو بطور اصطلاح کے دیگر ادبی اصطلاحات کی کتب یا مضامین میں دیکھتے ہیں یا اولین ناقدین، فلسفی یا ادباء کے ہاں دیکھتے ہیں۔ تو بطور اصطلاح اس کا استعمال کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے۔ کشاف سائنسی و تکنیکی اصطلاحات میں ماحولیات کی تعریف کچھ اس انداز سے درج ہے۔ ماحولیات: "جان داروں اور ان کے ارد گرد کی آب وہوا اور ماحول کے درمیان بننے والے رابطے اور تعلق کا مطالعہ اسے ماحولیاتی حیاتیات بھی کہتے ہیں۔"[6] فلسفہ ماحول کو بطور اصطلاح پہلی بار آرن نائس (Arne Naess) جو کہ ناروے کے فلسفی تھے انہوں نے 1972ء-1973ء میں استعمال کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ:

> "فلسفہ ماحولیات فطرت کی جبلی قدر پر اصرار کرتا ہے۔ یہ مغربی فلسفے کی قائم کردہ انسان فطرت کی ثنویت کو ماحولیاتی بحران کا سبب قرار دیتا ہے اور اقدار کی بشر مرکزیت سے ماحول اساس نظام کی طرف شفٹ کا مطالبہ کرتا ہے۔"[۷]

اس کے علاوہ ماحولیاتی تنقید کو اصطلاح کے طور پر پہلی مرتبہ استعمال کا دعوی "ولیم رئیکرٹ" نے 1978ء میں اپنے مقالے "ادب اور ماحولیات: ماحولیاتی تنقید میں ایک تجربہ" میں کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ماحولیاتی تنقید کو بطور اصطلاح استعمال کرنے کے بارے میں ایک امریکی نقاد "کارل کروبر" کا دعوی بھی ہے۔ ان کا مضمون "Home at Grasmere : Ecological Honlinem" جو 1974ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ماحولیاتی تنقید کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ "صوفی گلزار احمد کی مرتبہ اور محمد شمیم ہاشمی کی نظر ثانی شدہ "کشاف اصطلاحات نفسیات (1993)" میں ماحولیات کے حوالے سے درج ہے کہ:

ماحولیات (Ecology) حیاتیات کی وہ شاخ جو عضویہ اور ماحول کے باہمی تعامل کا مطالعہ کرتی ہے۔"

ماحولیات کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو انسان اس دنیا میں آنے کے بعد جس چیز سے سب سے پہلے واقفیت اختیار کرتا ہے وہ اس کا ماحول ہی ہے۔ تو گویا انسان اور ماحول کا رشتہ ازل سے ہے جو ابد تک قائم رہے گا۔ ماحولیات اور انسان کے تعلق کا ذکر تو تقریباً تمام مذاہب میں بھی ملتا ہے اور صرف اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ واضح الفاظ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان نے اپنے ہاتھوں سے ہی اپنے ماحول کو تباہ و برباد بھی کرنا ہے اور مغرب میں شروع ہونے والے صنعتی انقلاب سے یہ بات واضح بھی ہو گئی ہے کہ جہاں ان مشینوں سے ہماری زندگیوں میں بہت سی سہولیات آئی ہیں۔ تو وہاں ان کے بے دریغ استعمال سے ہم نے نظام فطرت کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔

جب ہم ماحولیاتی تنقید کے آغاز کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو انسان جب تخلیق کیا گیا تو سب سے پہلے اس کا واسطہ جس سے پڑا وہ اس کا ماحول (Environment) ہی تھا۔ اسی لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں تمام مذاہب میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں ہم چند مذاہب میں ماحولیات کے حوالے سے جو تعلیمات، اقوال و آراء پائی جاتی ہیں۔ ان کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم "بدھ مذہب" کی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو بدھ مذہب کو عموماً ماحولیاتی مذہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بانی مہاتما بدھ کی زندگی پر روشنی ڈالیں تو ان کی ساری کی ساری زندگی ہمیں

فطرت (Nature) کی محبت سے بھری پڑی نظر آتی ہے کیونکہ اس کی پیدائش، شعور، وعظ اور نجات سب ماحولیاتی اطراف سے منسلک نظر آتی ہیں۔ اس کی پیدائش پارک میں ہوئی تھی اور اس کو روشنی ایک پیپل کے درخت کے نیچے ملی تھی اور وہ اکثر بانس کے جنگل جاتا تھا اور اس کی وفات بھی کھلے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اپنی نقل و حرکت میں بھی وہ ماحولیاتی عناصر کا خیال رکھتا تھا۔ مگر آج ہم اپنے ہاتھوں سے ان ماحولیاتی عناصر کو نست و نابود کرنے کے درپے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اگر ہم یہودیت کی مذہبی تعلیمات کو ماحولیاتی عناصر کے ضمن میں دیکھیں۔ تو اس میں ہے کہ جب اللہ نے پہلے انسان کو خلق کیا تو اسے جنت کے تمام درختوں کے پاس لے گیا اور کہا کہ میری تخلیق کو دیکھو کیسی خوبصورت ہے۔ جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے۔ تمھارے لیے پیدا کیا ہے اور تم کائنات کو برباد نہیں کروگے کیونکہ اگر تم نے اس کو برباد کیا تو کوئی اور اس کو ٹھیک نہیں کر سکتا ہے۔ تو آج اگر ہم خود پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کیا کر رہے ہیں ہم طاقت اور نت نئی ایجادات کے نشے میں اپنے ماحول اور کائنات کو اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کرتے جا رہے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جب ہم عیسائیت کے مذہب پر غور کرتے ہیں۔ تو یہاں پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کائنات کا خادم ہے۔ مگر وہ خادم سے مالک بن بیٹھا ہے۔ کیونکہ کتاب پیدائش میں تو ہے کہ خداوند نے نباتات کو پیدا کیا ہے اور زمین کو ان کو اگانے کا حکم دیا ہے اور خدا نے ہی مچھلی اور جانوروں اور سمندری و فضائی اور رینگنے والے جانوروں کو پیدا کیا ہے۔ اس نے ہی پانی (سمندر، دریا، ندی نالے، بارش) کو پیدا کیا اور انسان جس کو اس کائنات کا خادم مقرر کیا گیا تھا وہ اپنے فرائض سے غافل ہو کر اس کا مالک بن گیا ہے اور آج جتنی بھی موسمی تبدیلیاں یا وسائل کی تجدید کاری ہے۔ آلودگی کے مسائل ہیں یا پانی کی آلودگی کے مسائل، آبادی کے مسائل ہیں یا جنگلی حیات کے اس سب میں جو ہستی قصور وار ہے۔ عیسائیت کی نظر میں وہ انسان ہی ہے۔ جو اپنے ماحول کو مالک بن کر تہس نہس کرنے پر تلا ہوا ہے۔

اس طرح اگر ہم اپنے مذہب اسلام کی روشنی میں ماحولیات کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ تو نہ صرف قرآن مجید بلکہ احادیث رسول ﷺ میں بھی اس کا تذکرہ بیش بہا بار ملتا ہے۔ مذہب اسلام کے مطابق اللہ

تعالیٰ نے کائنات میں موجود شجر، حجر، حیوانات، نباتات، جمادات، حشرات غرض ہر چیز کو بنی نوع انسانیت کی خدمت کے لیے تخلیق کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ کہ: "اور مسخر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ "(۸) ٹھیک اسی طرح سورہ ابراہیم میں اللہ نے ارشاد فرمادیا ہے۔ کہ: "جب سنا دیا تیرے رب نے کہ اگر احسان مانو گے تو وہ اور بھی دوگنا تم کو دے گا اور اگر ناشکری کرو گے۔ تو میرا عذاب بہت سخت ہے" (۹) اس آیت میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم قدرت کے عطا کردہ وسائل کا درست طریقے سے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تو اللہ ہمیں مزید عطا کرتا جائے گا اور اگر ہم ان کو تباہ و برباد کر کے اللہ کی ناشکری کریں گے۔ تو اس کی سزا کے طور پر اللہ ہم سے ان نعمتوں کو چھین کر ہمیں عذاب دے گا اور آج اگر ہم اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑاتے ہیں تو ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ جب سے ہم نے قدرت کے نظام میں دخل اندازی کی ہے تب سے ہی ہمارا ماحول بھی ہمارا مخالف ہو گیا ہے۔ گویا قدرت ہماری دخل اندازی کی سزا دے رہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی احادیث رسول ﷺ میں دیکھتے ہیں تو وہاں بھی اس حوالے سے ہمیں کئی احادیث رسول ﷺ ملتی ہیں جن میں ماحول کی حفاظت کے بارے میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضرت جابر سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا اور میں مدینہ کو حرام کرتا ہوں۔ اس کے درختوں کو نہ کاٹا جائے اور نہ اس میں شکار کیا جائے۔ "(۱۰) یعنی آپ ﷺ نے خود ہی درختوں کے کٹاؤ اور پرندوں کے شکار کی ممانعت کر دی۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کوئی مسلمان جو پودا لگاتا ہے یا کھیتی لگاتا ہے اور پھر اس سے کوئی انسان یا پرندہ یا جانور کھاتا ہے۔ تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ "(۱۱) گویا ہمارے ہاتھ سے لگے ہوئے درخت پودے جب تک لوگوں یا جانوروں کے کام آتے رہیں گے۔ ہمارے لیے بھی باعث اجر و ثواب ہیں۔

اب مذاہب کی تعلیمات سے آگے چل کر اگر آج کے جدید دور کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو ماحول اور انسان کے رشتے کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے ادیب، شعراء، نقاد ہی نہیں بلکہ ہر شعبے کے افراد نے اس

حوالے سے کسی نہ کسی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر رکھا ہے لیکن باقاعدہ طور پر اس موضوع کو مخصوص کر کے اس پر لکھا جانے کا آغاز کافی بعد میں عمل میں آیا ہے۔اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ جب ہم پہلے سے موجود دیگر تنقیدی دبستانوں کی داغ بیل ڈالنے والے ناموں پر غور کرتے ہیں۔تو وہاں ہمیں بڑے بڑے نامور مفکر،ادیب اور نظریہ ساز (رولاں بارت،دریدا،سوشیور،لیوتار،فوکو،ایڈورڈ سعید،ماشرے،ٹیری ایگلیٹن، چکرورتی اور کئی دیگر) ملتے ہیں۔وہاں ماحولیاتی تنقید کے حق میں آواز بلند کرنے والوں میں ہمیں صرف چند گنے چنے استاد،دانشور اور ادباء نظر آتے ہیں۔جن کے خیالات و نظریات فطرت،انسان اور ادب کے تعلق کو نمایاں کرتے ہیں۔

باقاعدہ طور پر "ماحولیاتی تنقید" کے آغاز کے حوالے سے جب ہم بات کرتے ہیں ۔تو دوسری عالمی جنگ(1945۔1939) کے دوران ہونے والے ایٹمی دھماکوں کے پس منظر میں ماحولیاتی تنقید کا جنم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔جب انسان نے طاقت کے نشے میں مخمور ہو کر نہایت ضرر رساں ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے ماحول کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا اور جس کا خمیازہ نہ صرف اس وقت موجود افراد بلکہ آنے والے تمام بنی نوع انسان بھگت رہے ہیں اور شاید رہتی دنیا تک بھگتتے بھی رہیں۔جبکہ ادبی دنیا میں اس کو منظر عام پر آئے نصف صدی سے بھی کم کا عرصہ ہوا ہے۔لیکن اس کا کنیوس بہت وسیع ہے جس میں ماحولیاتی عناصر و فطرت کی عکاس تحاریر،شاعری،جنگلی حیات کے قصے کہانیوں کے متن پر بحث کی جاتی ہے۔

ماحولیاتی تنقید کی بنیاد "لارنس بائل" اور "جو نتھن بیٹ" نے ڈالی تھی۔مگر اس سے بھی قبل کی بات کی جائے تو:

> "سب سے اول Gilbertwhite جو وسط سترہویں صدی میں تھا،کو ماحولیات Ecology کا بانی مانا جاتا ہے۔وسط سترھویں صدی کا زمانہ فطرت پسند (Naturalist) فلسفیوں کا زمانہ تھا۔جب ان میں یہ بحث چھڑی کہ کیا فطرت میں ترتیب ہے۔جس کا احترام اور تحفظ کیا جانا چاہیے۔"[۱۲]

بطور تحریک ماحولیاتی تنقید کی پہلی لہر 1960ء میں "رچل کیرسن" (Rachel carson) کی کتاب "(سائلنٹ سپرنگ) Silent Spring" سے امریکہ میں شروع ہوتی ہے۔ جس میں کیرسن نے امریکی معاشرے کو درپیش مسائل جو ماحول کے بگاڑ کا موجب ہیں اور یہ مسائل کیونکر سامنے آرہے ہیں ان کی وجوہات کیا ہیں اس پر بحث کر رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کو امریکہ میں کافی مخالفت کا سامنا بھی رہا مگر یہ ہی کتاب ماحولیاتی انصاف اور آگاہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

1990ء کی دہائی میں ماحولیاتی تنقید کی دوسری لہر کا آغاز ہوتا ہے اور اس میں ایسے نقاد کی شمولیت ہوتی ہے جن کی کوششوں سے ہی اس تنقیدی نقطہ نظر کو ایک دبستان کی شکل دی گئی۔ 1992 میں ایک ماحولیاتی ادبی تنظیم Association for the Studies of literature and Environment(ASLA) قائم ہوئی تھی۔ جس کے قیام کا مقصد ہی ماحولیاتی ادب پر تحقیق کرنا اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہنا تھا۔ "1993ء میں پیڑک مرفی (Patrick Murphy) نے Interdisciplinary Studies in Literature and Environment (ISLE) کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا جو ماحولیاتی فکر کو اجاگر کرنے میں ایک پلیٹ فارم (platform) ثابت ہوا۔"[۱۳] یوں بیسویں صدی کے اواخر تک ماحولیاتی تنقید کو اپنی جداگانہ حیثیت کو منوانے میں کامیابی مل ہی گئی تھی۔ دیکھا جائے تو ادبی منظرنامے پر خود کو منوانے میں ماحولیاتی تنقید کو قریب تیس سال لگ گئے تھے جبکہ اس کے برعکس دیگر تنقیدی نظریات (تانیثیت، ساختیات، مابعد نوآبادیات، نو تاریخیت، نو مارکسیت) وغیرہ کو بہت جلد ہی مقام مل گیا تھا۔

ماحولیاتی تنقید کو ابھرنے میں جو اتنا وقت لگا اس کے پیچھے بھی کئی وجوہات تھیں۔ جن میں سے سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ ماحولیاتی ادبی مطالعات کی اساس رکھنے والے لوگ باقاعدہ طور پر ادبی نقاد نہ تھے۔ جبکہ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ ماحولیاتی تنقید کا آغاز ہی ماحولیاتی انصاف اور ماحولیاتی بحران کے حوالے سے تھا۔ جس نے سیاسی قوتوں کی اجارہ داری کو چیلنج کر دیا تھا۔ جس وجہ سے اسے اس محاذ پر بھی کوشش کرنی پڑی۔ مگر ماحولیاتی تنقید اور اس کے ہم عصر تنقیدی نظریات کے درمیان دوری اور مغائرت کی اصل وجہ ان دو کا تصور دنیا اور مطالعاتی منہاج ہے۔

"تاریخی، نفسیاتی، مارکسی، ساختیاتی، مابعد جدید تنقید جیسے دبستانوں میں دنیا سے مراد 'سماجی اور نفسی' دنیا ہے۔ یہ سب نظریات ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے جس انسانی تجربے کا تجزیہ، تحسین، تعبیر اور تعین قدر کرتے ہیں۔ وہ زبان، معاشرہ، تاریخ، سیاست، معیشت، شعور و لاشعور جیسے عناصر سے مرکب ہوتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید اس تصورِ دنیا اور انسانی تجربے کی اس تعبیر پر سوال قائم کرتی ہے۔"(۱۴)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ادباء و نقاد ماحولیاتی تنقید کی تعریف کن الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں اور کس کی نظر میں ماحولیاتی تنقید کیا ہے؟ اس ضمن میں ہمیں زیادہ تر جو مواد ملتا ہے۔ اس کا تعلق امریکی، برطانوی اور یورپی ادباء و ناقدین کے ہاں ہی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اردو زبان میں ماحولیاتی تنقید پر مشتمل کتب نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں وہ بھی زیادہ تر تراجم یعنی انگریزی سے اردو ترجمہ کی گئی ہیں۔

ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے شیرل گلاٹفیلٹی (Cheryll Glotfelty) کچھ اس انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں:

"ماحولیاتی تنقید کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ انسانی دنیا طبعی دنیا سے منسلک ہے؛ اس پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے اثرات کو قبول بھی کرتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید فطرت اور ثقافت کے مابین باہمی روابط بالخصوص ادب اور زبان کے ثقافتی اوضاع کو موضوع بناتی ہے۔ ایک تنقیدی موقف کی حیثیت سے یہ ایک طرف ادب سے وابستہ ہے اور دوسری طرف زمین سے، جب کہ ایک نظری کلامیے کے طور پر یہ انسانی اور غیر انسانی مخلوق کے مابین مکالمے کی راہ ہموار کرتی ہے۔"(۱۵)

Simon Estok کہتے ہیں کہ ماحولیاتی تنقید کا کام مطالعہ فطرت یا ادب میں فطرت کی عکاسی کے مطالعے سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ماحولیاتی تنقید کے منصف کو بیان کرتے ہوئے کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"It is a theory that is committed to effecting change by Analyzing the function: thematic, artistic, social, historical ideological, theoretical or otherwise of Natural environment or aspects of it, represented in documents (literary or other) that contribute to material practices in material worlds "(16)

ولیم ہاورتھ William Howarth کے مطابق ماحولیاتی تنقید کچھ یوں ہے:

"ماحولیاتی تنقید فطرت اور کلچر کے درمیان ہمہ وقت موجود ان علامتوں اور قدری اشاروں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ جو ہیئت اور معانی کا تعین کرتے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید ہمیں باور کراتی ہے کہ زندگی کلام کرتی ہے۔[۱۷]

Cheryll Glotfelty ماحولیاتی تنقید کی تعریف کچھ اس انداز میں کرتی نظر آتی ہیں:

"Ecocriticism is the study of the relationship between literature and the physical environment." [18]

ولیم روئیکرٹ ماحولیاتی تنقید کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:۔ "ادب کے مطالعات میں ماحولیات اور ماحولیاتی تصورات کا اطلاق کرنا ہے۔"[۱۹] ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کے مطابق ماحولیاتی تنقید کی تعریف اس انداز سے بیان کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماحولیاتی تنقید:۔ "ادب اور طبعی ماحول کے مابین رشتوں کے مطالعے کا نام ہے۔[۲۰] شیرل گلاٹیفلٹی ماحولیاتی تنقید کے بارے میں اپنا نقطہ نظر کچھ اس طرح سے واضح کرتی ہوئیں نظر آتیں ہیں:

"ماحولیاتی تنقید کیا ہے؟ سادہ لفظوں میں ماحولیاتی تنقید ادب اور طبعی ماحول کے مابین رشتوں کے مطالعہ کا نام ہے۔ جیسے تانیثی تنقید ایک صنفی شعور کے تناظر میں ادب اور زبان کا جائزہ لیتی ہے اور مارکسی تنقید پیداوار اور معاشی طبقات کی روشنی میں ادبی متن کو مرکز مطالعہ بناتی ہے؛ اسی طرح ماحولیاتی تنقید، ادبی مطالعات کے لیے ایک زمین مرکز منہاج اختیار کرتی ہے۔"[۲۱]

مندرجہ بالا نظریات و تعریفات کو دیکھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماحولیاتی تنقید اپنے موضوعات، مسائل ،ترجیحات و دلائل کے حوالے سے معاصر تنقیدی دبستانوں سے الگ درجہ رکھتی ہے چونکہ ماحولیاتی تنقید کا محرک فطرت کو لاحق حقیقی خطرات ہیں ۔ جبکہ ساختیات، پس ساختیات، نومارکسیت، تانیثیت اور مابعد نوآبادیات کے محرکات لسانی، فلسفیاتی، ثقافتی و تاریخی ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں

کہ اساطیری عہد کے بعد دنیا کا تصور کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس میں انسان کے تمام افعال میں ثقافت کو نمایاں اہمیت حاصل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ثقافت اور فطرت میں نہ صرف فاصلہ حائل ہو گیا تھا بلکہ اکثر ثقافت کا فطرت پر ترجیح دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارے ادباء، نقاد و فلاسفر حضرات نے اپنی صلاحیتوں کو دنیا میں اپنے زیر تابع کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کی واضح امثال پہلے سے موجود نظریات میں با آسانی دیکھی جا سکتی ہیں کہ کیسے ان کی دل چسپی کا محور صرف اور صرف سمٹ کر ثقافتی حد تک رہ گیا تھا۔ مگر ماحولیاتی تنقید ان سے ہٹ کر فطرت، ادب اور انسانی رویوں پر بات کرتی اور سوال اٹھاتی نظر آتی ہے۔

ii۔ ادب اور ماحولیات:

ماحولیات کا بنیادی تصور کچھ یوں ہے کہ " ہر شے دوسری شے سے جڑی ہے۔" اس حوالے سے ماحولیاتی تنقید کے پہلے ناقدین میں سے اہم نقاد "ولیم روئیکرٹ نے اس تصور کا اطلاق ادب پر کیا اور ادب کی 'ماحولیاتی شعریات' دریافت کرنے کی کوشش کی۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ماحول میں موجود کوئی بھی چیز ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح 'ادب کے ماحول' میں خواہ کوئی متن ہو یا پھر کوئی ادبی واقعہ، ادب کی تخلیق میں کام آنے والے عوامل (تاریخی، سماجی، سیاسی، سوانحی)، ادب تخلیق کرنے والے ذرائع (صنف کی رسمیات، زبان)، ادب کے تخلیق کار اور اس سے استفادہ کرنے والے کردار (مصنف اور قاری) یہ تمام ہی ایک دوسرے کے ساتھ ایک زنجیر میں پروئے ہوئے ہیں۔ ان کے اثرات ایک دوسرے کے اوپر اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی طور پر ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں ہیئتی تنقید جو یہ دعوی' کرتی نظر آتی ہے کہ 'ادب ایک خود مختار اکائی ہے۔' محل نظر آتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف ماحولیاتی تنقید کا مفروضہ کہ ادب رشتوں کا نظام ہے۔ ساختیاتی تنقید کے مماثل نظر آتا ہے۔ مگر ماحولیاتی تنقید میں ساختیات کی بانسبت رشتوں کے نظام کو کافی زیادہ وسعت حاصل ہے۔ ماحولیاتی تنقید میں ماحولیاتی تصورات کا اطلاق ادب پر کیا جاتا ہے اور اس میں انسانی ثقافت اور فطرت کے درمیان موجود رشتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ مطالعہ کسی کو برتر یا اعلی قرار دینے کی بجائے مساوی اور آپسی عزت و احترام کے رشتے پر مبنی ہوتا ہے۔

ماحولیاتی تنقید اپنی ادبی حیثیت میں کسی تنقیدی تھیوری سے زیادہ ایک طرز مطالعہ کا نام ہے۔ ادب اور ماحول کے رشتے پر اٹھائے گئے سوال نے جس تنقیدی طرز مطالعہ کی بنیاد قائم کی۔ اس کو دور اولین میں "سبز انتقاد"، "ماحولیاتی شعریات"، "سبز شعریات" اور سبز ثقافتی مطالعات کا نام دیا گیا تھا۔ جوزف میکر Joseph Meeker ادب اور ماحولیات کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انسان زمین کی واحد ادب تخلیق کرنے والی مخلوق ہے۔ اگر ادب کی تخلیق نوع انسانی کا منفرد وصف ہے تو پھر انسانی رویوں اور قدرتی ماحول پر اس کے اثرات کی بھی شفاف اور ایمان دارانہ تحقیق ہونی چاہیے۔ تاکہ یہ تعین ہو سکے کہ انسانیت کی فلاح اور بقا کے لیے ادب کا کیا کردار ہے (اگر ہے تو)؟ نیز یہ دوسری انواع اور ارد گرد کی دنیا کے ساتھ انسانی رشتوں میں کن بصیرتوں کو نمایاں کرتا ہے؟ کیا یہ ایک ایسی سرگرمی ہے جو ہمیں دنیا سے قریب کرتی ہے۔ یا ہمارے اندر اس کے لئے کدورت کو جنم دیتی ہے؟ فطرت کے انتخاب اور ارتقا کے اس ناقابل رحم تناظر میں کیا ادب ہماری بقا کے لیے زیادہ کردار ادا کرتا ہے۔ یا ہماری معدومیت کے لیے۔"(۲۲)

ولیم روئیکرٹ ادب کو توانائی محفوظ کرنے کا ذخیرہ اور ہماری زبان کو تخلیقی توانائی کو محفوظ کرنے والے ذرائع میں سے ہی ایک ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ محفوظ کی گئی توانائی، تخلیقی توانائی اور زبان کے مراکز سے ہی ادب میں منتقل ہوتی ہے اور پھر یہ ہی توانائی جب قاری اس فن پارے سے فیض یاب ہوتا ہے تو قاری کی طرف بہتی ہے اور قاری سے پھر قوت متخیلہ اور پھر زبان کے مراکز کی طرف۔ ولیم روئیکرٹ کا کہنا ہے۔ کہ:۔ "ادب میں بہنے والی توانائی قابل تجدید ہوتی ہے۔ سورج سے خارج ہونے والی توانائی کے برعکس ادب کی محفوظ توانائی ختم یا منتشر نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسرے متون میں منقلب ہو جاتی ہے۔"(۲۳) ولیم روئیکرٹ کو اس دعوے کی تائید معاصر تنقیدی نظریات بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو روئیکرٹ کے یہ خیالات ماحولیات کے سائنسی تصورات اور ادبی تخلیقی تجربے کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی ایک مربوط کوشش ہے۔ مگر ان کی یہ تعریف صرف اور صرف ادب اور ماحولیات کے رشتوں کی ہی وضاحت کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ محدود ہے۔

"اس حوالے سے ہی وین ڈیل ہیرس(Wendell Harrison) نے اپنے مضمون (Towards an Ecological criticism: contextual Versus Unconditioned Literary Theory) میں ادب اور طبعی دنیا کے تمام ممکنہ رشتوں کو اس تعریف میں شامل کر کے ماحولیاتی تنقید کے کردار کو مزید وسعت دی ہے۔"[۲۴] ماحولیات اور ادب کے تعلق کے حوالے سے جب ہم دیگر دبستانوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ماحولیاتی تنقید ان سب سے ہٹ کر سوال اٹھاتی نظر آتی ہے جیسا کہ:

۱۔ فطرت کی حفاظت کے سلسلے میں انسان کی جو ذمہ داریاں ہیں۔ ان پر ہمارے تخلیق کار قلم اٹھا رہے ہیں یا ان سے کنارہ کشی اختیار کر گئے ہیں؟

۲۔ ادب میں ماحول کی ترجمانی کس انداز سے کی گئی ہے؟ کیسے فطرتی مناظر بادل، بارش، ندی، نالے، دریا، سمندر، پرندے، جانور، پہاڑ، ہوا، کھیت وغیرہ کو فکشن یا شاعری میں پیش کر رہے ہیں؟

۳۔ ہماری فطرت کو جو خطرات لاحق ہیں۔ ان کو ادب میں کس طرح بیان کیا جارہا ہے؟

اب اگر دیکھا جائے تو ماحولیاتی تنقید کے تین رخ سامنے نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ادب کے اصول بھی قریب قریب وہی ہیں۔ جو ماحولیات (اکالوجی) کے ہیں۔ دوسرا کچھ یوں ہے کہ انسانی ثقافت اور طبیعی دنیا میں کوئی مغائرت نہیں ہے اور تیسرا یہ کہ انسان نے طبیعی دنیا کی تسخیر کے چکر میں اسے تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور بذات خود ہی اپنی سلامتی کو خطرات کا شکار کر لیا ہے۔

ماحولیاتی تنقید انسان کے کیے گئے تجربات میں سے ایک نیا تصور سامنے لے کر آتی ہے کہ انسان کا تجربہ اس کی ثقافت میں جڑیں رکھتا ہے اور یہ کہ انسانی ثقافت سماجی دنیا کے ساتھ ساتھ طبیعی دنیا سے بھی منسلک ہے اور اسی وجہ سے وہ طبیعی دنیا سے متاثر ہوتی بھی ہے اور اسے متاثر کرتی بھی ہے۔ "ایک تنقیدی موقف کے طور پر اس کا ایک قدم ادب میں اور دوسرا زمین پر ہے، اور ایک نظری کلامیے کے طور پر وہ انسانی اور نا انسانی دنیا کے درمیان رابطہ استوار کرتی ہے۔"[25] ماحولیاتی تنقید نے انگریزی ادب خاص طور پر امریکہ کے قدیم ادب میں پائی جانے والی راعیانہ ادبی روایت پر خاص طور پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے اور یہ راعیانہ ادب چراگاہوں، جنگلوں، دریاؤں اور دیہاتی زندگی کی الگ ہی تصویر دکھاتا نظر آتا ہے۔ یہ سائنس و ٹیکنالوجی کی

حامل معاشرت و اخلاقی و روحانی قدروں سے عاری زندگی کے مقابلے میں ایک 'سبز دنیا' کا تصور پیش کیا جاتا ہے:

"سبز دنیا بنیادی طور پر شہری دنیا سے مکمل لا تعلقی اور حقیقی دنیا کی طرف مراجعت کے لیے وجود میں آتی ہے۔ راعیانیت حال اور مستقبل میں فطرت اور اس کی پیچیدگیوں کی بہتر سائنسی تفہیم، اس کی قدیم طاقت اور اس کا استحکام کے لیے منطقی آگاہی کا تقاضا کرتی ہے۔ نیز یہ بہ زعم خود مہذب معاشرے کی اقدار پر سوال اٹھاتی ہے۔"[۲۶]

iii۔ رومانوی شعور اور ماحولیاتی شعور:

رومانوی شعور میں فطرت کو سراہا جاتا ہے۔ اس کی جزئیات کی تعریف کی جاتی ہے۔ رومانویت میں فطرت کو ایک جز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ ماحولیاتی شعور میں فطرت نگاری کو اس کی موجودہ صورت حال کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ فطرت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے رونما ہونے سے انسانوں، جانوروں و دیگر مخلوقات پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ کا نام ماحولیاتی شعور ہے۔

الغرض اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رومانوی شعور میں فطرت کو ایک جز کے طور پر لیا جاتا ہے جس میں ماحول اور اس ماحول میں موجود اشیاء کی خوب صورتی کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن ماحولیاتی تنقید میں فطرت کی تمام جزئیات، کیفیات اور ان کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس ماحول کا عکس ادب میں کیسے نمایاں ہو رہا ہے اور ادب پر اس ماحول اور اس میں ہونے والی تبدیلیاں کیا اثرات مرتب کر رہی ہیں۔

iv۔ اردو ادب میں ماحولیاتی تنقید:

جیسے گزشتہ ادوار میں رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، تانیثیت، ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مارکسیت، مارکسی تانیثیت، نو آبادیات، ما بعد نو آبادیات وغیرہ یکے بعد دیگرے اردو ادب میں متعارف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا مقام بناتی گئی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں

صدی کے آغاز میں ہونے والے صنعتی انقلاب، ایٹمی ہتھیاروں کے جنگوں میں ہونے والا بے جا استعمال، بڑھتی ہوئی آبادی اور انسانوں کا قدرت کے عطا کردہ وسائل کا بے دریغ استعمال وضیاع نے ادب کو ایک نئے رجحان سے روشناس کروایا ہے۔ جسے ماحولیاتی تنقید کا نام دیا گیا ہے اور یہ رجحان اردو ادب میں ابھی نیا نیا ہے۔

اردو شعر و ادب میں ماحول اور فطرت کے عناصر کے استعمال کے آثار تو ابتدائی دور سے ہی نظر آتے ہیں۔ مگر اس سب کے ساتھ ہی فطرت اور ماحول کو جو مسائل در پیش تھے اور یہ کس حد تک سنگین تھے۔ اس پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی۔ اس کی واضح مثال کچھ ایسی ہے کہ آئے روز ہونے والے ایٹمی دھماکوں سے ہونے والے نقصانات پر تو لکھا جاتا رہا ہے مگر اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہولناکی کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ ہمارے ادباء، مفکرین، شعراء اور ناقدین نے اپنے متن میں ساری کوشش صرف اور صرف ملکی و غیر ملکی مسائل پر ہی رکھی ہے۔

فن کار کا اپنے ارد گرد کے ماحول اور اس میں ہونے والے واقعات سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن وہ صرف ماحول کا ہی ہو کر نہیں رہتا ہے بلکہ دیگر نمائندگان سماج مورخ و صحافی حضرات کا کام بھی سر انجام دے سکتا ہے۔ اس لیے ہر ادیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا بہترین نبض شناس ہوتا ہے کیونکہ کوئی بھی فن کار اپنے اندر کے داخلی خیالات سے جب متاثر ہوتا ہے تو پھر ہی لکھتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی خارجی کیفیات کو بھی خارج از ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ماحول کیسا بھی ہو حساس اشخاص پر گہرے اثر چھوڑتا ہے اور کسی بھی معاشرے کے شعراء و ادباء کا تعلق حساس طبقے سے ہی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

> "فن کار اپنے ماحول کا پروردہ ہونے کے باوجود، تخیلی سطح پر اس سے اپنا رشتہ منقطع کرتا ہے۔ اس کے فن میں نمو کرنے والے واقعات یا کردار حقیقی ماحول سے عدم تعلق کی بنا پر اپنے فنی وجود کی سچائی کا احساس دلاتے ہیں۔"(۲۷)

اب اگر اردو ادب کے کینوس کو دیکھا جائے ۔ تو دیگر تنقیدی دبستانوں کی طرح ماحولیاتی تنقید بھی ہمارے ہاں کافی تاخیر سے پہنچی ہے اور ابھی تک اس میں کوئی خاطر خواہ کام باقاعدہ طور پر نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اور صرف چند مضامین لکھے گئے ہیں اور کچھ ترجمہ شدہ مضامین، ایک ترجمہ شدہ مضامین پر مشتمل کتاب

اورنگ زیب نیازی کی ہے جو انہوں نے ماحولیاتی تنقید کے بنیادی مباحث پر مشتمل مضامین کا ترجمہ کر کے مرتب کی ہے۔اس کے علاوہ نسترن احسن فتیحی کی کتاب "ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ" ہے لیکن اس سے قطع نظر اگر ہم فکشن یا شاعری کی بات کرتے ہیں۔تو ہمارے ہاں ادب کی تمام اصناف میں ماحولیاتی تنقید کے آثار پائے جاتے ہیں۔ذیل میں ہم چند فکشن نگاروں اور شعراء کا تذکرہ کریں گے۔جن کے ہاں اس تنقیدی دبستان پر مشتمل مواد پایا جاتا ہے۔

اردو ادب کی تمام ادبی اصناف میں ہمیں ماحولیاتی عناصر کا تذکرہ تو ملتا ہے اگر بطور تنقید و تجزیہ کے حوالے سے اس پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا۔تنقیدی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو "امداد امام اثر کا تنقیدی نظریہ" میں امداد امام اثر کو اردو ادب کا پہلا ماحولیاتی نقاد کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "کاشف الحقائق" میں باغبانی ،دھان، سبزیوں، فصلوں، شفق، برف، ریگستان، سورج، چاند، شجر، سحر، شام سرسوں، جنگل، پودوں جیسی ماحولیاتی علامتوں کو شاعری میں استعمال کرتے ہوئے ان کو ماحولیاتی معنویت دیتے ہوئے اس کو اردو تنقید میں ایک نظریہ کے طور پر پیش کیا تھا۔

اردو افسانے کے دور اولین کو ماحولیاتی تنقیدی تناظر میں دیکھیں تو ہمیں کئی بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے ہاں ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے کام ہوا ہوا ملتا ہے یہاں تک کہ اولین افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ہمیں یہ رنگ بخوبی نظر آتا ہے۔ان افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، ابن سعید، عبد اللہ حسین، مسعود اشعر، حسن منظر، فہیم اعظمی، خالدہ حسین، طاہرہ اقبال، انتظار حسین، محمد حمید شاہد، توصیف احمد ملک وغیرہ کے ہاں ہمیں ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے مواد ملتا ہے لیکن یہ تمام افسانے باقاعدہ طور پر ماحولیاتی تنقید کے زیر اثر نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ چونکہ فن کار ہو یا ادیب شاعر ہو یا تنقید نگار یا پھر محقق سب پر ان کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے مگر اب اردو ادب میں بھی باقاعدہ طور پر ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے نہ صرف افسانے بلکہ دیگر اصناف میں َ بھی کام ہو رہا ہے۔

ماحولیاتی تنقید اور فلم کی دنیا کے تعلق کو بیان کیا جائے۔تو اردو ادب میں پہلی فلم جو ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے بنی ہے۔یہ ایک اینیمیٹڈ فلم ہے جو جنگلی حیات کے حوالے سے بنائی گئی ہے جس کا پیغام جنگلی

حیات کا تحفظ ہے۔ اس فلم کا نام "اللہ یار اینڈ دی لیجنڈ آف مارخور" ہے۔ جس کی کہانی عزیز ظہیر خان نے لکھی ہے۔ اگر اس کی کہانی کا پس منظر دیکھتے ہیں۔ تو وہ کچھ یوں ہے۔ اللہ یار اپنے خاندان کے ساتھ خوش حال زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ ان سے الگ ہو کر جنگل میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں اس کی دوستی جانوروں سے ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ مل کر شکاریوں کا مقابلہ کرتا ہے اور مارخور کو شکاریوں سے بچا کر اس کے گھر تک پہنچاتا ہے یوں اس فلم میں ہم انسانوں کے لیے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ہمیں اپنے ساتھ ساتھ اپنے ماحول اور اس میں موجود دیگر جاندار و بے جان اجسام کا بھی خیال رکھنا چاہیے کیونکہ ان کی بقا سے ہی ہماری حیات قائم ہے۔

ناول اور ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں پہلے سے موجود کئی ناولوں میں ماحولیاتی تنقید کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے حجاب کا ناول "پاگل خانہ" جو 1988ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اپنی نوعیت کا پہلا ناول ہے ۔ جس میں ماحولیاتی مسائل کو زیر بحث لایا گیا تھا۔ اس کے بعد 1992ء میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول "بہاؤ" بھی ماحولیات کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ 2004ء میں ارشد چہال کا ناول "پہاڑ گلی"، 2015ء میں عاطف علیم کا ناول "مشک پوری کی ملکہ"، 2017ء خالد فتح محمد کا ناول "کوہگراں"، 2018ء میں صفدر زیدی کا ناول "بھاگ بھری" 2019ء میں سائنس اسکالر صادقہ خان کا ناول "دوام"، اختر رضا سلیمی کے دو ناول "جندر" اور "جاگے ہیں خواب میں" اور وحید احمد کے دو ناول "مندری والا" اور "زینو" یہ تمام ناول ماحولیات کے فلسفے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔

اردو ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اردو ادب میں ماحولیات کے حوالے سے شاعری کا وسیع ذخیرہ ہمارے ہاں کے اکثر شعرائے کرام کے کلام میں واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے ہاں دیکھتے ہیں۔ تو ان کے ہاں شاعری میں فرد اور فطرت کے رشتے کو موضوع بنا کر اس کا زمین کے ساتھ جو رشتہ ہے اس حوالے سے "نوائے زمستان، جاڑا اور گرمی، مثنوی آب زلال، کوہ ہمالہ جیسی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان کے کلام کا کافی حصہ ایسا ہے کہ جس کا مطالعہ ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں کیا جا سکتا ہے۔ مجید امجد کے کلام میں بھی ماحولیات کے حوالے سے کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ خاص طور پر ان کی نظم "توسیع

شہر "جس میں آبادی کے اضافے کے باعث شہر کو وسیع کرنے کی غرض سے جو درخت کاٹے گئے اور قدرتی ماحول کو جو تباہ کیا گیا اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار میں

جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار

گھنے سہانے چھاؤں چھڑکتے بور لدے چھتنار

بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم

قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار

کتنے ہیکل جھڑتے پنجر چھٹتے برگ وبار

سہی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال

مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل"

اس کے علاوہ جن شعراء کے ہاں ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے مواد ملتا ہے۔ ان میں محمود علی محمود کی "سورج داسی" بدیع الزماں کے ہاں " آم کا پیڑ میرے آنگن میں "نو بہار صابر کی "دھرتی کی خوشبو" حرمت الاکرام کی "اماوس کا چاند" میں ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے کافی زیادہ مواد ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر شعراء کے ہاں ہمیں ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے شواہد نظر آتے ہیں۔ ان میں پروین شاکر اور شاہد ماکلی بھی شامل ہیں۔

v۔ اردو معاصر ناول نگاروں کا پس منظری مطالعہ:

معاصر اردو ناول کا پس منظر کافی وسیع ہے۔ لیکن اگر ماحولیاتی تنقید کے ضمن میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پس منظر کو برتتے ہوئے اردو میں متعدد معاصر ناول شائع ہو چکے ہیں اور آمنہ مفتی کے ناول ان ناول نگاروں سے کس حد تک منفرد ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے چند ناول نگاروں اور ان کے ناولوں کا جائزہ لیں گے۔

اس حوالے سے سب سے پہلے حجاب امتیاز علی کی بات کرتے ہیں۔ جو پاکستان کی نامور افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ پہلی مسلمان خاتون پائلٹ بھی ہیں۔ ان کے ناولوں کے موضوعات رومانی و نفسیاتی ہوتے تھے۔ مگر ان کے ناول "پاگل خانہ" جو 1988ء میں شائع ہوا تھا اور ان کا آخری ناول تھا۔ اس ناول کے نام کے حوالے سے وہ خود کچھ اس انداز سے لکھتی ہیں کہ:

> "اس کتاب کا نام پاگل خانہ ہے سوچ کر رکھا اور اس میں جو کچھ لکھا یہ محض میرے ذہنی اختراعات یا شاعرانہ تصورات کا نتیجہ نہیں بلکہ میری اور آپ کی بد قسمتی سے ٹھوس اور عبرتناک حقائق کا نچوڑ اور سخت محنت اور گہری تحقیقات کا نتیجہ ہے۔"(۲۸)

اس ناول میں انہوں نے ماحولیاتی مسائل، جنگی آلات کے بے دریغ استعمال کو باقاعدہ طور پر اپنے ناول میں شامل کر کے اسے اردو ادب میں ایک نئے رجحان کے طور پر متعارف کروایا۔ جو بظاہر ایک حساس دل کی لڑکی کا سفر نامہ ہے۔ جو دنیا میں موجود کرب کی جگہ سکون کی متلاشی ہوتی ہے۔ مگر وہ امن تلاش کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ یہ ناول بہت ہی حساس موضوع پر لکھا گیا ہے۔ مگر مصنفہ اپنے موضوع سے مکمل انصاف کرتی نظر آتی ہیں۔

اس کے بعد زمانی اعتبار سے مستنصر حسین تارڑ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جن کا ناول "بہاؤ" جو 1992ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس ناول کو باقاعدہ طور پر ماحولیاتی ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی کہانی پانچ ہزار سال قبل ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیوں کے حوالے سے ہے۔ انہوں نے اپنے ناول میں دریاؤں کے خشک ہونے کو کرہ حیات کی موت کی علامت قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک خشک ہوتا دریا زمین کی تخلیقی کوکھ کو

بانجھ کر کے رکھ دیتا ہے انہوں نے ماحولیاتی تغیر و تبدل کا تذکرہ تو بہت ہی زبردست انداز میں کیا ہے۔ مگر اس سب کے پیچھے کون سے عوامل ہیں۔ اس پر کوئی بحث یا بات نہیں کی گئی ہے۔

ماحولیاتی حوالے سے لکھے گئے ناولوں میں وحید احمد کا ناول "زینو" 2003ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس ناول میں فطرت کی منظر نگاری کے ساتھ ہی ہمارے قدرتی ماحول میں ہونے والے بگاڑ کو موضوع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول میں وحید احمد نے زینو کو سالوں پہلے گلیئشیئر میں منجمد کر دیا تھا اور پھر اسے سائنس کی کرشمہ سازی سے ہمارے آج میں زندہ کر کے قدیم وجدید ماحول کی منظر کشی کو بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ مگر زینو جو شفاف ماحول کا پروردہ تھا۔ جب آج کے دور میں آنکھ کھولتا ہے۔ تو اسے یہ ماحول دھندلا اور آلودہ نظر آتا ہے۔ اسے آج کے انسان، حیوان، درخت، پھول، پودے غرض ہر چیز ہی بیمار لگتی ہے اور یہ صرف زینو کا نقطہ نظر ہی نہیں بلکہ کوئی بھی ماضی کا انسان اگر آج کے دور میں آجائے تو اس کا وہی حال ہو گا۔ جو زینو نے محسوس کیا۔ وحید احمد نے ایک ہی کردار کے ذریعے قدیم و جدید کے ماحولیاتی فرق کو واضح کر کے پیش کر دیا ہے کہ کیسے ہم نے مشینی دور میں جیتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اپنے آج کے ماحول کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

اس کے بعد ماحولیاتی موضوع کے حوالے سے ارشد چہال کا ناول "پہاڑ گلی" سامنے آتا ہے۔ جو 2004ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول کا مرکزی کردار فطرتی مناظر اور قدرتی ماحول سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ ایک فاریسٹ آفیسر ہوتا ہے۔ جس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ پہاڑ گلی کے جنگلات کی حفاظت کرے اور اس کی خوبصورتی کو مزید چار چاند لگانے کی تگ و دو کرے۔ مگر ظالم ٹمبر مافیا اور محکمہ جنگلات کے کرپٹ آفیسر اس کی مخالفت کرتے ہوئے اس کا تبادلہ کروا دیتے ہیں اور پہاڑ گلی کے جنگلات کا خاتمہ کر کے اسے برباد کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں لینڈ سلائیڈنگ ہو کر نہ صرف ٹمبر مافیا کی موت کا سبب بنتا ہے بلکہ مقامی آبادی بھی اس عتاب کا نشانہ بنتی ہے۔ اس ناول میں ارشد چہال نے محکمہ جنگلات میں ہونے والی بے ضابطگیوں کی پول کھول کر رکھ دی ہے۔ اس ناول میں ماحولیاتی تنقید کی شاخ ایکو فیمنزم کے حوالے سے بھی مواد ملتا ہے۔

ماحولیاتی موضوع کے حوالے سے ایک اور ناول جو 2015ء میں شائع ہوا۔ محمد عاطف علیم کا "مشک پوری کی ملکہ" ہے۔ جس میں فطرت، ہمارا قدرتی ماحول اور اس ماحولیاتی نظام کے اندر ہونے والے بگاڑ جس کا سہرا بھی نسل انسانی کو جاتا ہے۔ یہ سب بہت ہی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مادہ (لیپرڈ) ہے۔ جس کو "گلدار" کا نام دیا گیا ہے۔ جو اپنی فطرت کے برعکس آدم خور بن جاتی ہے۔ مگر اس کے پیچھے بھی انسانی ہاتھ ہوتا ہے۔ جو اسے آدم خور بننے پر مجبور کر دیتا ہے کیونکہ جب اسے گولیاں مار کر زخمی کر کے اس کے بچوں کو اس سے چھین لیا جاتا ہے تو وہ انتقام پر اتر آتی ہے اور کئی انسانی جانوں کا خون کر دیتی ہے۔ ناول میں جنگل اور فطرت کے خوب صورت مناظر کو بہت ہی زبردست انداز میں قاری تک پہنچایا گیا ہے۔ محمد عاطف علیم نے نہایت باریک بینی سے ایک جانور کے حالات وواقعات کو پیش کیا ہے۔ ناول میں ہمیں فطرت نگاری، بن نگاری، راعیانیت، منظر نگاری کے کمال مرقعے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ناول کو ماحولیاتی تنقید کی شاخوں سماجی ومارکسی ماحولیات کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

2017ء میں "کوہ گراں" کے نام سے خالد فتح محمد کا ناول شائع ہوا۔ جو کہ ماحولیاتی حوالے سے خاصا اہم ناول سمجھا جاتا ہے۔ اپنے اس ناول میں پانی کو زندگی اور ماحول کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ ان کے ناول کے کردار چوہدری حلیم کے گاؤں سے پانی کے خاتمے کے سبب انسان اور جانور ہجرت کر جاتے ہیں۔ جس وجہ سے گاؤں اجڑ جاتا ہے۔ مگر وہ گاؤں تک پانی لانے کے لیے ناجائز طریقہ اختیار کرتا ہے اور ہیڈ مرالہ کو توڑ کر اپنے کھیت سیر اب کرتا ہے۔ مگر اس ناول میں دیکھا جائے تو مرکزی کردار کے خاکے کی بنت میں کئی خامیاں سامنے آتی ہیں۔

"بھاگ بھری" 2018ء میں شائع ہونے والا صفدر زیدی کا ناول ہے۔ جس میں صفدر زیدی جنگی جنون، دہشت گردی، انتہا پسندی جیسے ماحولیاتی اثرات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کے اندر ممکنہ ہونے والی ایٹمی جنگ اور اس سے ہونے والے نقصانات اور حالات وواقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کیسے جنگ کے بعد تاب کاری کے اثرات سے ماحول اور اس میں موجود تمام جان دار (حیاتیات و نباتات) تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں بلکہ آئندہ اس دنیا میں آنے والے نئے اجسام کیسے معذوری کا شکار ہوں

گے۔اس کے علاوہ آمر وقت کے ہاتھوں دریائے ستلج کی نیلامی اور دریائے راوی کو گندے نالے میں بدلنے کی سازش،ماحولیاتی عناصر کی بربادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

صادقہ خان جن کا تعلق کوئٹہ سے ہے اور وہ سائنس کی اسکالر ہیں انہوں نے 2019ء میں "دوام" کے نام سے ایک ناول لکھا ہے۔ناول کا موضوع بقول ناول نگار اپنے ماحول،زمین اور دھرتی سے جڑا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار "منتہا" عالمی خلائی ادارہ ناسا کو چھوڑ کر اپنے وطن کی خدمت کرتی نظر آتی ہے اور اپنی ریسرچ سے ہی امریکہ کا چہرہ بے نقاب کرتی ہے کہ کیسے وہ برقی و تاب کاری لہروں کے ذریعے زلزلوں کا باعث بن رہا ہے اور ان ہی زلزلوں اور دیگر قدرتی آفات میں گھر کر انسان تباہی کی طرف جارہا ہے۔اس حوالے سے صادقہ نے پاکستان کے شمالی علاقوں کو اور وہاں کے حالات کو اپنے ناول کے کینوس میں پیش کیا ہے۔اس ناول کو ماحولیاتی اور سائنسی دونوں شعبوں کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

مندرجہ بالا وہ ناول اور ناول نگار ہیں۔جن کے ناول ماحولیاتی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کے ناولوں میں ماحولیاتی تنقید کو کیسے اور کس حد تک پیش کیا گیا ہے اور آیا ان ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات میں اپنے موضوع کے ساتھ پورے طریقے سے انصاف کیا ہے۔اس حوالے سے بحث کی گئی اور اب ان ناول نگاروں کے اور آمنہ مفتی کے ناولوں میں کس حد تک انفرادیت پائی جاتی ہے۔اس پر آئندہ ابواب میں بات کی جائے گی۔

ج۔آمنہ مفتی کی سوانح اور شخصیت

i۔ مختصر کوائف اور شخصیت:

آمنہ مفتی کا نام ادبی حلقوں میں بطور ڈرامہ نگار،ناول نگار،افسانہ نگار،کالم نگار اور استاد کے طور پر جانا جاتا ہے۔آپ 10 جنوری 1977ء میں پاکستان کے شہر پاک پتن کے قریب واقع ایک فارم ہاؤس میں پیدا ہوئیں اور آپ کا بچپن وہیں پر گزرا۔آپ کا اصل نام "آمنہ بیگم" ہے اور قلمی نام "آمنہ مفتی" ہے۔اس حوالے سے بات کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا۔

> "میرے آباءواجداد کا تعلق دہلی (ہندوستان) کے قریب واقع ایک قصبہ ریواڑی سے تھا اور وہ وہاں کے عہدہ مفتی پر معمور تھے۔اس حوالے سے مفتی میرا سر نام بھی

ہے اور میرا نہیں خیال کہ آمنہ بیگم اور آمنہ مفتی میں کوئی خاص فرق ہے۔ مگر
کاغذات میں میرا نام آمنہ بیگم جبکہ ادبی دنیا میں میرا نام آمنہ مفتی کے نام سے جانا جاتا
ہے۔ پاکستان بننے کے بعد میرے آباء واجداد پاکستان ہجرت کر کے آ گئے تھے۔"[۲۹]

آپ کے والد کا نام مفتی محمد شجاع الدین حیدر تھا۔ وہ زمیندار تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کی والدہ کا نام نگہت نسرین ہے اور وہ ہاؤس وائف ہونے کے ساتھ مطالعہ کی بہت زیادہ شوقین ہیں اور زیادہ تر فکشن کو پڑھتی ہیں اور والدہ کا یہ شوق آمنہ مفتی صاحبہ کی گھٹی میں بھی شامل ہوا اور اسی مطالعہ اور فکشن پڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ لکھنے لکھانے کی طرف بھی آئیں۔ آپ کے آپ سمیت آٹھ بھائی بہن ہیں۔ آمنہ مفتی کے بڑے بھائی زمیندار ہیں، دوسرے نمبر پر جو بہن ہیں ان کا اپنا سکول ہے، تیسرے نمبر پر جو بہن ہیں وہ ڈاکٹر ہیں، جناح ہسپتال میں وہ پروفیسر ہیں، چوتھے نمبر کی بہن ہاؤس وائف ہیں، پانچویں نمبر کی بہن کینیڈا میں ایک اسکول میں مونیٹسوری استانی ہیں، چھٹے نمبر پر ان کی بہن شازیہ ہیں جو شاعرہ ہیں، ساتویں نمبر کی بہن ہاؤس وائف ہیں اور سب سے چھوٹی بہن آمنہ مفتی صاحبہ ہیں۔

اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں بتاتے ہوئے آمنہ مفتی صاحبہ نے کہا کہ:

"انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم (یعنی مونٹیسوری سے پرائمری) پاک پتن میں ہی میڈیم
شمع تاج کے بنائے گئے اسکول میں ہی حاصل کی تھی۔ میٹرک انہوں نے لاہور میں مال
ٹاؤن میں موجود ڈویژن پبلک اسکول سے کیا تھا۔ اس کے بعد گریجویشن لاہور کالج سے
کی اور اس کے بعد ایم۔اے صحافت انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔"[۳۰]

اپنے تعلیمی سلسلے کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ چونکہ سارا خاندان پڑھا لکھا تھا تو اس لئے زیادہ توجہ یہ ہی دی جاتی تھی کہ سائنسی مضامین کو فوقیت دی جائے اور مجھے خود بھی سائنسی مضامین خصوصاً بائیولوجی اور کیمسٹری بہت زیادہ پسند تھے۔ میڈیسن کی طرف میرا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا اور پھر ایف ایس سی میں

میرٹ نہ بن سکنے کے باعث مجھے خود بھی لگا کہ میں اس سب کے لیے نہیں بنائی گئی ہوں۔اس لیے گریجویشن میں میں نے انگریزی ادب اور صحافت کو پڑھااور پھر ایم۔اے کے لئے بھی صحافت کو منتخب کیا۔اس وقت میرا خیال تھا کہ میں دوسرا ایم۔اے ادب میں کروں گی مگر پھر فرصت ہی نہیں ملی اور مجھے بھی یہ احساس ہوا کہ محض ڈگریوں کی کوئی اتنی خاص اہمیت نہیں ہے بلکہ سب سے اہم بات آپ کا مطالعہ ہے۔فکشن کی طرف میرا رجحان والدہ کی وجہ سے مزید بڑھتا گیااور اس طرف یعنی لکھنے لکھانے کا مجھے شوق بھی تھا۔اس کے ساتھ نوجوانی کے دور میں مجھے آثار قدیمہ میں بھی دل چسپی تھی اور اس کے علاوہ قیمتی پتھروں میں مجھے بہت زیادہ دل چسپی تھی کہ یہ کہاں سے نکلتے ہیں کیوں اتنے قیمتی ہوتے ہیں ان میں کیاہوتا ہے اور ان کا انسانی نفسیات سے کیا تعلق ہے؟اور میں اس حوالے سے سوچتی تھی کہ میں اس کو بطور فیلڈ کے اپناؤں گی۔مگر ابھی تک اس حوالے سے پاکستان میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔اس کے علاوہ زیورات میں بھی میری دل چسپی تھی بلکہ ابھی بھی ہے۔آمنہ مفتی صاحبہ کی شادی 1999ء میں ہوئی تھی۔آپ کے دو بچے ہیں۔بڑا بیٹااے لیول کر چکا ہے۔اوراب یونیورسٹی کی تعلیم کے حوالے سے سرگرم عمل ہے۔جبکہ چھوٹا بیٹا اولیول تھری کا طالبعلم ہے۔لکھنے کا آغاز بہت کم سنی میں ہی یعنی چھ سات سال کی عمر سے ہی کر دیا تھا۔اس حوالے سے بات کرتے ہوئے آمنہ مفتی صاحبہ کا کہنا تھا کہ کوئی خاص نقطہ آغاز تو مجھے یاد نہیں پڑتا مگر غالباً چھ سات سال کی عمر میں پہلا مصرعہ کہا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔چھوٹی موٹی نظمیں،غزلیں لکھتی رہیں اور اپنا لکھاہوا استاد "شہرت بخاری" جو کہ ان کے والد کے کزن بھی تھے اور استاد شاعر بھی تھے۔تو ان کو دیکھا لیا کرتیں تھیں۔پھر زمانہ طالب علمی میں بچوں کو لکھنے کے لیے جو مضامین اور کہانیاں نمونے کے طور پر یاد کروا کر لکھوائی جاتی ہیں۔ان کی جگہ میں خود سے مضامین اور کہانیاں لکھا کرتی تھی۔اگر دیکھا جائے تو یہ سب چیزیں میری پریکٹس تھی۔میری شاعری کی پرنٹنگ کا سلسلہ 1991ء،1993ء کے درمیان شروع ہوااور کچھ نظمیں پرنٹ ہوئیں۔مگر صرف چند ایک پرنٹ کروائیں باقی نہ میں نے کبھی شعر کہانہ کہوں گی مگر شاعری میں موجود عروض اور دیگر قواعد وضوابط کی بندش کی وجہ سے جلد ہی یہ سلسلہ چھوڑ کر نثری دنیامیں قدم رکھا۔کیونکہ ان کی خداداد صلاحیتیں ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ وہ اپنے اور اپنے قاری کے درمیان کسی تیسرے انسان کو شامل کریں شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ شاعری اصناف میں مجھے غزل بے حد پسند ہے لیکن میں نے نظمیں اور وہ بھی بہت طویل نظمیں لکھیں۔جن کو لکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔اس کے لیے شاعری نہیں بلکہ نثری اصناف زیادہ بہتر رہیں گی اور ویسے بھی میں نے جو شاعری کی وہ

صرف اپنے لیے کی اور اس کے بعد وہ افسانہ لکھنے کی طرف آئیں اور ان کا پہلا افسانہ "پھر وہی دشت "1998ء میں شائع ہوا تھا اور یوں یہ سلسلہ شروع ہوا تھا جو آج تک جاری ہے۔

اپنی مصروفیات اور مشاغل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے آمنہ مفتی کا کہنا تھا کہ:

"مصروفیت لکھنے لکھانے کے حوالے سے ہی رہتی ہے۔ کتاب بینی میرا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے گھر داری پسند ہے۔ مجھے گھر کو سجانا، سنوارنا، مہمان داری، کھانے پکانا بہت پسند ہے۔ باغبانی میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اس کے ساتھ میں کاشت کاری بھی کرتی ہوں اور مجھے جانوروں اور پرندوں سے بھی بے حد پیار ہے۔ میں خود بھی ان کو پالتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے گھونسلوں سے گرا ہوا یا کوئی زخمی جانور یا پرندہ ملتا ہے۔ تو میں اسے بھی گود لیتی ہوں، پالتی ہوں۔ اس کے علاوہ جنگلی جانوروں کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ یہاں تک کہ ضرر رساں جانور بھی اگر ہمارے راستے میں نہیں آ رہا ہے تو اس کو بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ کیونکہ یہ دنیا جتنی ہماری ہے اتنی ان کی بھی ہے۔ اس لیے میں اس نظام کو متوازن کرنے میں لگی رہتی ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارے زیورات خاص طور پر مشرقی زیورات مجھے بے حد پسند ہے۔ میں نہ صرف ان کو خریدتی ہوں۔ بلکہ ہمارے پرانے زیورات جو ہماری ثقافت کا حصہ (جھومر، بالے، جھالے، مگر، پونچیاں) ہیں۔ ان کو پرانے کاریگروں کے ہاں جا کر دیکھتی بھی ہوں۔ کیونکہ ہر کاریگر کے ہاتھ کی ایک الگ بناوٹ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ میوزک اور رقص سے بھی بے حد لگاؤ ہے اور ہمارا مقامی رقص یعنی کلاسیکل رقص مجھے پسند ہے میوزک مجھے سیمی کلاسیکل سننے کی حد تک بے حد پسند ہے۔ اس کے بارے میں پڑھنا اور جاننا اس میں بھی میری دل چسپی ہے۔" (۳۱)

نثری اصناف میں آپ نے سب سے پہلے افسانہ لکھا پھر آپ نے اپنا پہلا ناول لکھا۔ اس کے بعد آپ نے ڈرامہ لکھا اور ڈرامے کے بعد آپ کالم نگاری کی طرف آئیں۔ آپ مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتی رہتی ہیں۔ مگر ان کا وہ موضوع جو سب پر حاوی رہا ہے ان کی تحاریر و اصناف میں وہ فرد کا معاشرہ میں وہ مقام ہے

جسے وہ بعض اوقات کھو دیتا ہے کسی مجبوری کے تحت یا کسی اور وجہ سے تو آپ اس کو سامنے لانے کے لیے کوشاں رہی ہیں۔اس کے علاوہ کامیڈی اور ٹریجڈی موضوعات پر بھی آپ لکھتی رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ابتداء میں آپ ایک اسکول میں پرنسپل کے طور پر بھی فرائض انجام دے چکی ہیں اور اب گزشتہ تین سال سے پنجاب یونیورسٹی میں فلم اسکرپٹ پڑھا رہی ہیں۔اپنے اسلوب کے حوالے بات کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ ان کے ناولوں میں "الطاف فاطمہ اور قراۃالعین حیدر" کے اثرات موجودہیں۔باقی آپ کے ہم عصر ناول نگاروں میں کئی بڑے بڑے نام (اشفاق احمد،عبداللہ حسین ، انتظار حسین ،بانو قدسیہ ، قرۃالعین حیدر،الطاف فاطمہ)جن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے فیض یاب ہونے اور سیکھنے کا بہت موقعہ ملا۔اس کے ساتھ شاعری کے حوالے سے استاد "شہرت بخاری" سے بہت کچھ سیکھا۔ادب لطیف کی ایڈیٹر صدیقی بیگم سے بہت قریبی تعلق تھا۔اس کے ساتھ ابھی بھی تارڑ صاحب، مرزااطہر بیگ کا مجھ سے بڑا مشفقانہ رویہ ہے۔یہ لوگ نہ صرف زمانی اعتبار سے بلکہ علمی ،ادبی اعتبار سے بھی مجھ سے بہت بڑے لوگ تھے۔مگر ان سب سے دوستانہ اطوار پر رشتہ قائم رہاہے۔جبکہ ڈرامہ میں شکسپئر کو چونکہ بہت زیادہ پڑھاہے میں نے تو مجھے لگتاان کا اثر ان کا اسٹائل میرے ڈرامے میں کہیں نہ کہیں سے آ ہی جاتا ہے اور آپ کے ڈرامے "اے پلس، ہم ٹی وی، ہم ستارے ،اے آر وائے، جیو ٹی وی ،ایکسپریس "پر آپ کے ڈرامے نشر ہو چکے ہیں ۔اس کے علاوہ "زی زندگی "پر اجازت نامہ لے کر کچھ ڈرامے نشر کیے گئے ہیں۔ افسانے میں مجھے کبھی کسی دوسرے کا اثر محسوس نہیں ہوا لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اردو ادب کا مطالعہ کیا جائے اور کہیں نہ کہیں "غلام عباس" کا اثر نہ ہو۔ایسا ممکن نہیں ہے۔

اگر بطور انسان آمنہ مفتی صاحبہ کے اخلاق و اطوار کی بات کی جائے۔تو آپ بے حد خوش اخلاق اور انسان دوست شخصیت کی مالک ہیں۔ہر ایک کے دکھ درد میں بلا تفریق شریک ہونے والی اور انسانوں ہی نہیں بلکہ چرند، پرند، جانور ہر ایک کا دکھ سکھ سمجھنے والی شخصیت کی مالک ہیں۔

ii۔ادبی خدمات:

کتابیں:

۱۔جرات رندانہ　　2007ء (ناول)

۲۔آخری زمانہ　　2010ء (ناول)

۳۔پانی مر رہا ہے 2018ء (ناول)

۴۔الو برائے فروخت نہیں (ڈرامہ)

ڈرامے:

۱۔جہیز	1جنوری2012ء
۲۔سبز پری لال کبوتر	11جون2012ء
۳۔اجل ان سے مل	2012ء
۴۔الو برائے فروخت نہیں	30اپریل2013ء
۵۔دل محلے کی حویلی	13مئی2013
۶۔رخصتی	12مارچ2014ء
۷۔اضطراب	2اپریل2014ء
۸۔مایا	2015ء
۹۔جگنو	17اپریل2015ء
۱۰۔مول	30مئی2015ء
۱۱۔فرواکی اے بی سی	24جولائی2015ء
۱۲۔پریت نہ کریو کوئی	3نومبر2015ء
۱۳۔دادارے دادا	2015ء
۱۴۔جب تک عشق نہیں ہوتا	27جولائی2016ء
۱۵۔نیلم کنارے	8ستمبر2017ء
۱۶۔مرکز یقین	2017ء
۱۷۔آخری اسٹیشن	13فروری2018ء
۱۸۔زن مرید	2مارچ2018

۱۹۔ گھگھی   2018ء

۲۰۔ٹیلی فلم

اسٹیج ڈرامہ:

ا۔'من وتو'عرف خمار سنان

افسانے:

افسانے آپ کے چالیس سے اوپر ہیں۔جو "ادب لطیف، کاغذی پیرہن، اوراق، ماہ نو، سویرا، "وغیرہ جیسے رسائل وجرائد میں چھپتے رہے ہیں اور ان میں سے کچھ اب بھی چھپ رہے ہیں۔ مگر باقاعدہ طور پر یہ ان کے پاس جمع کر کے رکھے ہوئے نہیں ہیں۔

کالم:

آپ کے کالم "بی بی سی اردو" پر آتے ہیں۔اپنے کالم کے موضوعات کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ میرے موضوعات زیادہ تر معاشرتی ہوتے اس کے علاوہ انسان اور نیچر کے تعلق پر بھی لکھتی ہوں اور اس پر میں خصوصی طور پر لکھ رہی ہوں کہ کس طرح انسان اپنے ہاتھوں اپنے ماحول کا دشمن بنا ہوا ہے۔اس کے ساتھ عالمی دنیا کے ساتھ جو ہمارا تعلق ہے اس پر بھی لکھتی ہوں۔ ملکی اور عالمی سیاست اور تعلقات پر بھی لکھتی ہوں۔لیکن ملکی سیاست پر میں اس لیے نہیں لکھتی کیونکہ میں اس کو کہیں سے بھی سیاست نہیں سمجھتی اور میرے خیال میں ہماری عوام بھی نہ سیاسی طور پر باشعور ہیں نہ بات کو سمجھتے ہیں۔اس لیے ہماری سیاست میں بہت مسائل ہیں۔ دوسرا کمزور طبقات خواہ وہ پاکستانی ہوں یا کسی اور جگہ سے ان میں خواتین ہوں یا بچے، اقلیتی برادری ہو یا کمزور لوگ ان کے حق میں آواز اٹھاتی اور حکام وعوام کو جھنجھوڑنے کی کوشش میں لکھتی ہوں۔

فلم:

ا۔'خیمے میں مت جھانکیں'

اعزازت:

۱۔ پین ایوارڈ2007ء

۲۔ لکس ایوارڈ برائے سکرین رائٹنگ2014ء

۳۔ ساحر ایوارڈ2015ء

۴۔ گولڈ میڈل2019ء

حوالہ جات

۱۔ شمس الحق، ماحولیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۱

۲۔ ہادی رضا، قانون اسلامی میں ماحولیاتی تحفظ، غیر مطبوعہ، مقالہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۳۱

۳۔ شان الحق حقی، (مرتبہ)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اول ۱۹۹۵ء، ص ۸۲۸

۴۔ ماحولیات نظام۔ آزاد دائرۃ المعارف۔ ویکیپیڈیا

https:// wikipedia.org>org>wiki> ،۲۲مارچ ۲۰۲۰ء

۵۔ مکین احسن کلیم، سائنسی و فنی ڈکشنری، اردو سائنس بورڈ، لاہور، پاکستان، طبع ششم ۲۰۱۷ء، ص

۶۔ نشتر، محمد اسلام، کشاف سائنسی و تکنیکی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۹۳ء، ص

۷۔ کرسٹو فر مینز[Christopher Manes]"Nature and slince"، مشمولہ The Ecocriticism Reader:Landmark in Literary Ecology, مرتبہ شیرل گلاٹفیلٹی، [Cheryll Glotfelty], Pg 22.

۸۔ مولانا محمد جونا گڑھی، القرآن (مترجم)، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منورہ، سعودی عرب، ص ۱۱۲۹

۹۔ مولانا محمد جونا گڑھی، القرآن (مترجم)،، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منورہ، سعودی عرب، ص ۶۷۴

۱۰۔ محمد بن عیسی، سنن ترمذی، اشرفی بک ڈپو دیوبند، ص ۳۵۴

۱۱۔ محمد بن عیسی، سنن ترمذی، مکتبہ اشرفیہ دیوبند، ص ۱۶۷

۱۲۔ اے۔ آر۔ اگوان، Islam and Environment، IOS، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۴

۱۳۔ کین ہلٹنر [Ken Hiltner] (مرتبہ) Ecocriticism:The Essential Reader
نیویارک: روٹلج، ۲۰۱۵ء، ص ۱

۱۴۔ ارسلا۔ کے ہیسی [Ursula K.Heise]، " The Hichhiker,sGuide to
Ecocriticism" مشمولہ Ecocriticism :The Essential Reader، مرتبہ کین ہلٹنر [Ken
Hiltner]، 164

۱۵۔ شیرل گلاٹفیلٹی، "Literary Studies in an age of Environment
Crisis" مشمولہ، The Ecocriticism Reader:Landmarks in Literary
Ecology، مرتبہ شیرل گلاٹفیلٹی [Cheryll Glotfelty]، pg xix

۱۶۔ Estok,Simon(2005)"Shakespeare's and Ecocriticism:An Analysis of
Home and Power of King Lear pp 16-17.

۱۷۔ ولیم ہاورتھ [William Howarth]، " some principles of ecocriticism"، مشمولہ The
Ecocriticism Reader:Landmarks in Literary Ecology، مرتبہ شیرل گلاتفیلٹی
[Cheryll Glotfelty]، pg 77۔

۱۸۔ Glotfelty,Cheryll (1996) and Harold Formm (Eds) The Ecocriticism
Reader:Landmarks in Literary Ecology Athens and London:University
of Georgia, pp43.

۱۹۔ اورنگ زیب نیازی،ڈاکٹر،(مترجمہ)ماحولیاتی تنقید نظریہ اور عمل(منتخب مضامین)،اردو سائنس بورڈ،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۱۷

۲۰۔ اورنگ زیب نیازی،ڈاکٹر،(مترجمہ)ماحولیاتی تنقید نظریہ اور عمل(منتخب مضامین)،اردو سائنس بورڈ،۲۰۱۹ء،ص۸

۲۱۔ اورنگ زیب نیازی،ڈاکٹر،(مترجمہ)ماحولیاتی تنقید نظریہ اور عمل(منتخب مضامین)،ص۱۵۔۱۶

۲۲۔ جوزف میکر[Joseph Meeker]، The Comedy of Survival:Studies in Literary Ecology(چارلس:سکرائبز سنز،1974ء)ص۳۔۴

۲۳۔ ولیم روئیکرٹ[William Rueckert]، "Literature and Ecology:An Experiment in Ecocriticism"،مشمولہ The Ecocriticism Reader:Landmark in Literary Ecology،مرتبہ شیرل گلاٹفیلٹی[Cheryll Glotfelty]،۱۲۳۔۱۰۵

۲۴۔ شیرل گلاٹفیلٹی،" Literary Studies in an Age of Environment Crisis، مشمولہ،The Ecocriticism Reader :Landmarks in Literary Ecology،مرتبہ شیرل گلاٹفیلٹی[Cheryll Glotfelty]،xxi۔

۲۵۔ شیرل گلاٹفیلٹی،ہیرلڈ فرام،The Ecocriticism Reader،یونیورسٹی آف جارجیا پریس،جارجیا،۱۹۹۶ء،ص۱۹

۲۶۔ گلین-اے-لو[Glen-A.Love]" Revaluing Nature:Towards an Ecological criticism"،مشمولہ، The Ecocriticism Reader:Landmarks in Literary Ecology،مرتبہ شیرل گلاٹفیلٹی[Cheryll Glotfelty]،ص۲۳۵

۲۷۔ گوپی چند نارنگ،پروفیسر،"اردو افسانہ روایت اور مسائل"،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور، ۲۰۰۲ء،ص۱۶۹

۲۸۔ حجاب امتیاز،مصنف کا نوٹ،مشمولہ پاگل خانہ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۸ء،ص۶

۲۹۔ آمنہ مفتی سے مقالہ نگار کا انٹرویو،بذریعہ ٹیلی فون،۱۸ستمبر ۲۰۲۰ء،بروز جمعہ

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

باب دوم:

"جرات رندانہ" اور "آخری زمانہ" کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ

الف۔ جرات رندانہ کا تعارف:

آمنہ مفتی کا یہ پہلا ناول ہے۔ جس کا اشاعت کا سال اکتوبر 2007ء ہے۔ یہ ناول پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر لاہور سے الفیصل ناشران نے شائع کیا ہے۔ اس ناول کے اندر 177 صفحات جبکہ اس کے ابواب کی تعداد 48 ہے۔

ناول "جرات رندانہ" کی پہلی قرات سے بظاہر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے گرد و پیش میں پائے جانے والے روزمرہ کے حالات و واقعات پر مبنی ایک عام سی معاشرتی کہانی ہے۔ جس میں ہمارے آس پاس کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور روایتی واقعات لکھے گئے ہیں مگر جب کہانی آگے بڑھتی ہے اور اس کے اسرار و رموز نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کے اندر بنیادی طور پر پاکستان میں پچھلے کچھ عرصے سے جاری رجحانات کہہ لیں یا حالات و واقعات جس کے باعث انسان کبھی شہر سے گاؤں تو کبھی گاؤں سے شہر کا رخ کرنے پر مجبور ہوتے رہے ہیں۔ اس ناول میں اسی معاشرے کے عمر رسیدہ ادھیڑ عمر و نوجوان طبقے کی کہانی ہے۔ مگر ان سب میں سے کچھ لوگ تو حوصلہ کھو بیٹھے اور کچھ ڈٹ کر حالات کے سامنے سینہ تان کر کھڑے رہے مقابلہ کرتے رہے لیکن دھرتی ماں سے جدا ہونے کے بارے میں خیال بھی ذہن و دل میں نہ لایا۔ ان

کرداروں میں دیہی اراضی کے مالک منیر جو پولیو کے مریض ہیں اور اس کی بے حد حسین و ذہین بہن ایسے کردار ہیں جنہوں نے مشکل حالات میں ایسے فیصلے کیے جو اپنے اندر جرات مندانہ اثرات رکھتے ہیں۔

اس کا مرکزی کردار (منیر) ایک ایسا نوجوان ہے۔ جو پولیو کا مریض ہونے کی وجہ سے بہت ہی زیادہ حد تک احساس کمتری کا شکار ہے اور اس کا یہ احساس کمتری کا جذبہ اس پر اس حد تک حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ جب بھی کچھ کرنا چاہتا ہے یا زندگی میں آگے بڑھنے کا سوچتا ہے تو وہ کامیابی نہیں حاصل کر پاتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں موجود ہر انسان اس کی چھوٹی رہ جانے والی پولیو زدہ ٹانگ کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود بھی وہ ایک محب وطن شہری ہے۔ اس کو کئی بار مواقع ملتے ہیں کہ وہ پاکستان کو چھوڑ کر بیرون ملک چلا جائے اور وہاں پر اپنے مستقبل کے نئے سپنے سجائے مگر وہ ہر بار اپنے وطن کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے وطن سے بے حد پیار ہے۔

آمنہ مفتی کے ناولوں کے حوالے سے تبصرے و آراء کی اگر بات کی جائے تو آمنہ مفتی کے ناول جرات رندانہ پر کئی ادبی شخصیات نے تبصرے کیے ہیں۔ آمنہ مفتی کے اس ناول کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ناول نگار "خالد فتح محمد" کہتے ہیں:

> "جرات رندانہ آمنہ مفتی کا پہلا ناول ہے۔ یہ ایک نیم مفلوج (پولیو زدہ) نوجوان کی کہانی ہے۔ جو زندگی اور اس سے منسلک معاشرتی اقدار کو شکست دینے کے لیے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ ناول کے بیان کی خوبی ناول نگار کی کہانی پر گرفت ہے جو آج کے دور میں ہمیں کم ہی ملتی ہے۔ عام تاثر ہے کہ ناول ایک وسیع تر صنف ہے۔ سو اس میں جو چاہے ٹھونستے جاؤ۔ اس ناول کی خوبی اس کا اپنے محور کے اندر رہنا ہی ہے اور کہانی میں کہیں جھول نہیں ملتا۔ جس کے سبب ناول کا توازن آخر تک قائم رہتا ہے۔ جو ہنر وری کے علاوہ کچھ نہیں۔"(۱)

ب۔ جرات رندانہ میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیہ:

آمنہ مفتی کا شمار ہمارے دور کے ان ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ جن کے قلم سے لکھے جانے والے ناول کے موضوعات میں ہمارے ارد گرد موجود حالات و واقعات کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ نت نئے موضوعات بھی ناول نگاری کا حصہ بنتی دیکھائی دیتی ہیں۔ آمنہ مفتی اپنے ناولوں میں ہماری تہذیب و معاشرت کے کئی عناصر کو تو اپنے قلم کا موضوع بناتی ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ناولوں میں ماحولیات کے عناصر کی شمولیت بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔

آمنہ مفتی ہمارے آس پاس موجود لوگوں میں پائے جانے والی مختلف توہمات، رسوم ورواج، ہمارے معاشی و معاشرتی مسائل، سیاسی رویے، حالات وواقعات کو تو بیان کرتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ ہمارے دور کے ماحول اور ماحولیاتی عناصر کو بھی اپنی وسعت نظری اور مشاہداتی نگاہ سے دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔

دریا، ندیاں، کھیت کھلیان، جانور، آبی مخلوق، جنگلی حیات، ہوا، پانی، بادل، بارش، پگڈنڈیاں وغیرہ وہ تمام ماحولیاتی عناصر جن کی ضرورت انسان کو روز ازل سے ہی ہے اور آج بھی انسانی زندگی کے لیے جو بے حد اہم ہیں۔ ان تمام کا تذکرہ ہمیں آمنہ مفتی کے ناولوں میں جگہ جگہ ملتا ہے اور ان کے قلم سے نکلنے والے الفاظ ہمیں اکساتے ہیں کہ ہم اپنے آج کے دور اور اس کے ماحولیاتی مسائل کا گذشتہ ادوار کے ساتھ نہ صرف موازنہ کریں بلکہ اس پر آواز اور قلم بھی اٹھائیں۔ وہ نہ صرف ماحول میں موجود مسائل کا پرچار کرتی نظر آتی ہیں۔ بلکہ آمنہ مفتی جس خوبصورتی اور باریک بینی سے ماحول میں پائی جانے والی اک اک شے کو دیکھتی، پرکھتی، جانچتی اور پھر ان کو لے کر کچھ اس انداز سے الفاظ کا جامہ پہناتی ہیں کہ ایسی امثال کم ہی دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔ اپنے ناول "جرات رندانہ" میں اس حوالے سے وہ کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

> "سڑک ایک میلے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چھانگا مانگا کے جنگل میں جا گھسی۔ گئی برسات کی ہریالی ٹوٹ کر درختوں پر برسی تھی، بوگن ویلیا اور بیل فلاور کی سرخ اور نارنجی بیلیں انگارہ سے پھولوں سے لدی دیو قامت درختوں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ لمحہ بھر کو یہ ہریاول اسے گھسیٹ کر وہاں لے گئی جب وہ درختوں کے گھنے گھتے ہوئے کاہی

سایوں میں سے گزرتی ٹرام میں سہمے بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا ہر موڑ پر رابن ہڈ سے متاثر ڈاکو تلوار سے ٹپکتے خون سے ہاتھ سرخ کیے کھڑا ہو گا یا پھر مہتاب محل کے ہلتے ہوئے چوبی تختوں تلے ٹھہرے آسیبی پانیوں سے چڑھی ہوئی ڈاڑھی اور سرخ آنکھوں والا جیالا ڈاکو نکل کر انہیں ثابت نگل جائے گا اور ہر بار وہ بچ جاتے تھے۔ ٹرام شہد بیچنے والوں کے چھتے سے گزرتی ہوئی اسٹیشن پر رک جاتی اور ہریالی کی اوٹ میں چھانگا مانگا کی روحیں انہیں کھا جانے کو کچکچاتی ہی رہ جاتیں۔" (۲)

اپنے ناول "جرات رندانہ" کے اس پیراگراف میں آمنہ مفتی نے جنگل اور اس کے ماحول میں موجود پیڑ، بوٹے، ڈالیاں، بیلیں، سبزے حتیٰ کہ سڑک تک کو بیان کرتے ہوئے الفاظ کے چناؤ میں نہایت ہی عمدگی کا مظاہرہ پیش کیا ہے کہ ان کے بیان کردہ الفاظ نے ماحول کے مناظر کو بن دیکھے ہی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے اور اپنے تخیل سے ہم اسی سرسبز و شاداب ماحول کا خود کو حصہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ قدرت کے حسین ماحولیاتی عناصر کو بہت ہی خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اپنے ناول "جرات رندانہ" میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کرتے ہوئے جنگلی حیات کے گزر بسر، رہن سہن انسانی زندگی میں ہونے والے ان کے عمل دخل کا تذکرہ کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"نہر کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں گیدڑوں اور نیولوں کے بھٹ تھے اور راتوں کو یہ جانور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے آنے جانے والوں کو ہراساں کرتے تھے اور سناٹا پڑنے پر ہک ہک ہکی ہو ہو 'کا شور مچا کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے تھے۔" (۳)

آمنہ مفتی کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ ماحولیاتی عناصر کی دلکشی کو بیان کرتی ہیں تو اس کے ساتھ ہی انسان کا اس ماحول کے حوالے سے اپنی زندگی کے ساتھ کیا رشتہ، تعلق یا واسطہ ہے اس کو بھی منظر عام پر لاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ناول کا کردار اگر کسی منظر میں ماحولیاتی عناصر کے ساتھ منسلک ہوتا دکھتا ہے تو ساتھ ہی اس کی ذاتی زندگی کا کوئی گوشہ بھی جڑ جاتا ہے اور اپنی ذات کو وہ اسی ماحول کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ آپ ناول "جرات رندانہ" کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"منیر گاڑی سے اتر کر ٹاہلی کے نیچے جا بیٹھا۔ جنگل میں خاموشی تھی اور امن۔ درختوں پر گلہریاں دوڑی پھر رہی تھیں اور مختلف النواع پرندے اپنی ازلی روٹین کے تحت کام میں لگے ہوئے تھے، سارا جنگل ایک خوش گوار سی مصروف سی چہچہاہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ایسی ہی خوبصورت چہچہاہٹ ان کے گھر میں بھی پھیلی رہتی تھی۔ ابا صاحب میز کرسی لگائے حساب کرتے تھے۔ امی کوفتوں کا قیمہ پسواتی، گیہوں صاف کرواتی، پرانے گودڑ لحاف ادھر سے ادھر کرتی سارے گھر میں گوریا کی سی مصروفیت سے پھرا کرتی تھیں۔ شہلا اور آپی کونوں کھدروں میں گھس کر گڑیوں کی بڑی شاندار شادیاں رچایا کرتی تھیں۔"[۴]

یہاں پر ناول میں موجود مرکزی کردار "منیر" کو جب لاہور میں خبر ملتی ہے کہ اس کے ابا صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ تو پہلے تو اس کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا ہے کہ اس کے ابا جان اس دنیا میں موجود نہیں رہے ہیں۔ مگر پھر وہ گھر کی راہ لیتا ہے۔ مگر رستے میں اس کو اپنے پولیو زدہ ہونے کی وجہ سے کئی طرح کے خیالات پریشان کرتے ہیں اور وہ کچھ افسردہ سا گاڑی سے اتر کر جنگل میں کچھ وقت کے لیے رکتا ہے۔ تو وہاں کا ماحول دیکھ کر اس کے سامنے اپنے گھر اور اپنے ماضی کے حالات و واقعات آ جاتے ہیں اور وہ محسوس کرتا ہے کہ جو ماحول یہاں اس جنگل میں اس کے سامنے موجود ہے۔ ایسا ہی سب کچھ اس کے اپنے گھر کے مکینوں اور اس کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے۔ مگر اب یہ سب ماضی بن چکا ہے۔ ان ہی خیالات کے ساتھ اس کے ذہن میں آتا ہے کہ وہ تو اب اپنے گھر کا سربراہ یعنی بڑا بن چکا ہے اور اس کے پاس کئی طرح کے اختیارات آ چکے ہیں۔ اس تخیل کے ساتھ ہی اس کے اندر ایک بجلی کی سی پھرتی بھر جاتی ہے۔ وہ خود کو مضبوط و توانا سمجھنے لگتا ہے۔

آمنہ مفتی کبھی کبھار بدلتی کیفیات کو اس وقت پائے جانے ماحول کے ساتھ اس انداز میں گٹھ جوڑ کر سامنے لے کر آتی ہیں کہ اس لمحے کس قسم کے حالات ہیں۔ ان کا ادراک ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ زمین کے موجودہ حالات اس وقت کس قسم کی تبدیلی کی جانب جاتے دکھ رہے ہیں۔ ان کے علم اس ثانیے میں

پائے جانے والے ماحولیاتی عناصر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے ناول "جرات اندانہ" میں اس کی عکاسی اس انداز سے پیش کرتی ہیں۔

"اس زمانے میں اسے "اداسی" کا لفظ بے حدHaunt کرتا تھا۔ ایک بے حد خوبصورت اور رومانٹک سا احساس۔ اے حمید کے افسانوں جیسی دیو مالائی فضا جہاں سیلون کے برساتی جنگلوں کی نمناک فضائیں طاری ہوتی تھیں۔ خنک گھاس پر استوائی درختوں کے پتے خزاں کی ہوا سے سرسراتے تھے اور ہوا میں چائے اور لیموں کے پھولوں کی پراسرار خوشبو تیرا کرتی تھی۔ صبح دم کہرے میں چھپے اشجار کے داماندہ داداس پتوں سے اوس نچڑ نچڑ کر نم زمین پر گرا کرتی تھی۔" (۵)

یہاں آمنہ مفتی ماحول کی خوب صورتی کو بہت ہی خوب انداز میں پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ کیسے وہ ناول کے کردار پہ چھائی ایک کیفیت سے اس وقت موجود ماحول اور دیگر مناظر کو ایسے بیان کرتی ہیں کہ سب کچھ واضح صاف صاف منظر نامہ آنکھوں کے سامنے لا رکھتی ہیں۔ ایسے ہی ایک اور منظر میں لکھتی ہیں:

"آم کے درختوں پر خزاں چھائی ہوئی تھی۔ لیکن داہنی طرف کےOrchard میں تمام ترشوں پر پھل لدا پڑا تھا۔ مالٹے، کینو اور گریپ فروٹ کے پودے ترچھی ترچھی روشوں میں، دور تک قطار اندر قطار، باوقار انداز میں جھکے جھکے کھڑے تھے۔ گل گل کے پودوں پر بڑے بڑے گل گل چمک رہے تھے اور فاختاؤں کا ایک جوڑا بڑے اطمینان سے آنولے کی جھاڑی کے پاس چہل قدمی کر رہا تھا۔ دور سے ٹیوب ویل کے برقی انجن کا دھیما دھیما شور سنائی دے رہا تھا۔ کھڑکی سے ذرا پرے ہو کر نالہ گزر رہا تھا جس پرHans Anderson Christian کی کہانیوں جیسا سفید چوبی پل بنا ہوا تھا۔ اس وقت نالے میں سے بڑی طلسماتی سی بھاپ اٹھ اٹھ کر خزاں کے اس شدید منظر نامے پر چھا رہی تھی۔ نالے کے پیچھے کئی ایکڑ گلاب کاشت کیا گیا تھا۔ پورا کھیت

سرخ سرخ گلابوں سے پٹا پڑا تھا۔ شہد کی مکھیاں دھند میں تیرتی ہوئی بزز بزز کرتی مصروف عمل تھیں۔ کھیتوں کی مینڈوں پر مگس بانی کے ڈبے رکھے تھے۔" (۶)

ناول "جرات اندانہ" میں آمنہ مفتی یہاں پر ہمارے دیہات میں پائے جانے والے ماحول کی منظر کشی کرتے ہوئے الفاظ کا ایسا چناؤ کرتی سامنے آتی ہیں کہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم خود اس منظر کا حصہ ہیں اور یہ کچھ ہم پڑھ رہے ہیں دراصل ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہم پر یہ سب بیت رہا ہے۔ ہم تخیلات میں نہیں بلکہ حقیقتاً اس ماحول میں ہیں اور ہمارے آس پاس وہی سب پایا جارہا ہے جو ہم ناول میں پڑھ رہے تھے اور یہاں مکمل طور پر دیہات میں موجود باغات اور اس کے آس پاس کے علاقے کی تصویر کشی بہت اعلی انداز میں کرتے ہوئے اس ماحول میں موجود دیگر اشیا و اجسام کا بھی نہایت باریک بینی سے نہ صرف جائزہ لیا گیا ہے بلکہ کمال مہارت سے ان کا ذکر بھی نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔

آمنہ مفتی اپنے ناول "جرات رندانہ" میں اپنے ایک کردار چودھری منور علی کے گھر اور اس کے آس پاس کے ماحول کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھتی دکھائی دیتی ہیں۔

"کھڑکی پر ولایتی گلاب کی گلابی پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی اور ایک شکر خورا بڑی دیر سے ان پھولوں پر منڈلا رہا تھا۔ باہر سڑک پر نورا چودھری صاحب کی فریزین گائیوں کو نہلا کر لا رہا تھا۔ پتلی کھال اور سبک چہرے والی سفید و سیاہ دھبے دار گائیوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ایک بے ہنگم سے آہنگ کے ساتھ بج رہی تھیں۔ گوداموں میں اناج بھرا ہوا تھا۔ کولڈ سٹور میں آلو کا بیج محفوظ تھا۔ ایجنسی میں کھاد کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گائیں گیابھن تھیں۔ بھینسیں لیاری۔ کھیتیوں میں گندم کے نئے پودے سر اٹھا رہے تھے اور پچھلی طرف لگے کڑھاؤ اور بیلنے سے گڑ کے شیرے کی مہک اٹھ رہی تھی۔" (۷)

ناول کے اس حصے میں آمنہ مفتی چودھری کے گھر اور اس کے جانور اور حالات کا ماحول قلم بند کرتے ہوئے ان کے آباء و اجداد اور ان کے زمین کے حوالے سے ہونے والے ردوبدل اور ان کے رشتوں کے جدا ہونے کے ماحول کو پردے پر دکھاتی ہوئی اس ناول کے مرکزی کردار کے والد مہاجر مرزا علیم بیگ اور

چودھری کے درمیان کے تعلق کو واضح کرتی ہیں اور اسی ماحول کو دیکھتے ہوئے چودھری منور علی اپنے ماضی کے ماحول اور ان حالات میں چلا جاتا ہے۔ جب اس کا خاندان ساتھ تھا اور پھر کیسے تقسیم پاکستان کے وقت ان کا کنبہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر دونوں ملکوں میں الگ الگ رہنے لگا اور الگ ہونے کے بعد کے ماحول نے ان کے حالات پر کب کیسے اور کس طرح اثر ڈالا اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی آمنہ اپنے ناول میں لاہور شہر کے علاقے "اچھرہ" کا منظر نامہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"باہر دسمبر کے آسمان پر بادل گھرے کھڑے تھے اور اچھرے کے باہر لنڈے کی دکانوں پر لوگ کھڑے روپے روپے پر لڑ رہے تھے۔ رمالوں اور نجومیوں اور پر اسراروں علوم کے ماہر پروفیسروں کے بورڈ بڑے بڑے دعوؤں کے بوجھ سے لدے کھڑے تھے۔ تلی مچھلی کی دکانوں پر ایک توندیل آدمی کھڑا پکوڑے چکھ رہا تھا اور دو فقیر لڑکے مکھیوں کی طرح اس کے چاروں طرف بھنبھنا رہے تھے۔" (۸)

ناول کے اس حصے میں آمنہ مفتی شہروں میں ہونے والے آبادی کے اضافے اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے جو مضر اثرات ماحول پر مرتب ہو رہے ہیں اور ان ہونے والے اثرات کی وجہ سے انسانی زندگی پر جو فرق آرہا ہے اس کو بیان کرتی نظر آرہی ہیں کہ آبادی میں اضافے کی وجہ سے لوگوں کے رویوں اور صحت کے مسائل میں آئے روز اضافہ ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ مختلف نام نہاد جعلی لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور ماحول میں ہونے والی اس تبدیلی کا اثر لوگوں کی معشیت پر بھی پڑرہا ہے۔ جس کی بدولت لوگوں کو بنیادی سہولیت ہی نہیں مل پارہی ہیں اور نتیجتاً لوگ چھینا چھپٹی پر اترنے کو تیار نظر آتے ہیں۔

آبادی میں ہونے والے مسلسل اضافے نے لوگوں کے معیار زندگی کو بے حد متاثر کر کے رکھ دیا ہے اور اس کا اثر ان کے روز مرہ حالات اور ان کے رہن سہن کی جگہ اور دیگر اشیا میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ایسے ہی ماحول کے ایک منظر نامے کو آمنہ مفتی اپنے ناول میں پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی اور اکلوتی سلاخ دار کھڑکی پر لائنوں والے سوتی پردے پڑے ہوئے تھے اور ایک پردے کے دو کنڈے اکھڑے ہوئے تھے۔ کتے

کے کان کی طرح لٹکے اس پردے سے جھلکتے گلی کے منظر میں ایک گہرا سانولا لڑکا
کھڑا Walls کی آئس لولی چوس رہا تھا اور ایک سبزی والا ریڑھے پر رکھی تازہ گاجروں
پر ڈونگے سے پانی چھڑک رہا تھا۔" (۹)

آمنہ مفتی کبھی کبھار بدلتے ہوئے ماحول کو اپنے آس پڑوس میں رہنے والے لوگوں سے وابستہ کرتی دکھائی دیتی ہیں اور ان کے اس عمل سے ہی اس وقت کیسے حالات تھے اور ماحول پر ان کا کیا عمل دخل تھا۔ سب سمجھ میں آجاتا ہے۔ بسا اوقات وہ زمین میں ہونے والے حالات کو فضا میں محوِ پرواز پرندوں کے ذریعے بھی بیان کرتی دکھتی ہیں اور دیکھا جائے تو یہ سب بلا واسطہ طور طریقے سے ماحول کی بھرپور عکاسی پیش کرتی ہیں۔ ایسے ہی حالات اور اس ماحول کا بیان آمنہ مفتی نے اپنے ناول "جرات رندانہ" میں ایسے کیا ہے۔

"آسمان خاکی بادلوں سے اٹا پڑا تھا۔ دو ایک چیلیں بے مقصدیت سے آسمان کے چکر
کاٹ رہی تھیں۔ فیروز پور روڈ کے ٹریفک کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ باورچی خانے
سے عظمانہ اور مانی کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ (۱۰)

ماحول میں پائے جانے والے خوبصورت مناظر کو آمنہ مفتی اپنے ناول میں جس انداز و اطوار سے پیش خدمت کرتی ہیں۔ ایسا مظاہرہ خال خال ہی کہیں کسی قلم کار کے ہاں دکھتا ہے اور کیسے ماحول میں پائی جانے والی خوب صورتی خراب سے خراب حالات و واقعات میں گھرے لوگوں میں بھی امید کی کرن دوڑا دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خوب صورت منظر نامے کے بارے میں اپنے پہلے ناول میں رقم طراز ہیں:

"باہر صحن میں دھڑاکے کی بارش ہو رہی تھی۔ کمرے میں گیس کا ہیٹر جل رہا تھا اور مانی
کی خوب صورت دل آویز آواز۔ موسیقی کرسٹل کے ننھے ننھے موتیوں کی طرح چھنک
چھنک کر بکھر رہی تھی۔ الفاظ کچھ خاص نہ تھے، میوزک کچھ عالی شان نہ تھا، ماحول کچھ
دبنگ نہ تھا لیکن شہلا کی بے زاری بڑی حد تک دور ہو گئی تھی اور اسے دری پر بیٹھے
ہوئے ٹکلے۔ خوش مزاج اور ذہین انکل اتنے برے نہ لگ رہے تھے۔ نہ مانی کا حد سے
زیادہ سو کھا پانا گوار لگ رہا تھا۔" (۱۱)

ماحول انسانی زندگی پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہمارا ماحول اچھا ہو گا تو ہم بھی اچھے طریقے سے کام کر سکیں گے اور اگر ہمارا ماحول ہی مایوسی لیے ہو گا تو ہمارے اندر بھی ناامیدی کے دیئے جلنے لگیں گے اور

ہم بھی اپنے حالات سے دل برداشتہ ہو کر امید کا دامن کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی حالات کے مارے ہوئے کردار آمنہ مفتی نے اپنے ناول میں تخلیق کیے ہیں۔ جن کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کے سامنے بیٹے ہوئے حالات وواقعات ہیں۔ ایسے ہی حالات وواقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"صحن کی بدہیئت اینٹوں پر بانس کی جھاڑو کی یکساں کھسر کھسر جس کا ایک خاص ردھم تھا۔ کھس کھس کھس اور ایک مخصوص وقفے کے بعد جھاڑو کی مونٹھ کا زور زور سے زمین پر مار کے تنکے برابر کرنا۔ دور سے چلتی ہوئی یہ آواز اب اس کی چارپائی کے قریب آتی جارہی تھی۔ لوہے کے چٹو میں دھمادھم دھما دھم نمک کوٹا جا رہا تھا۔ دھم دھم دھم۔ سل پہ جانے کیا پس رہا تھا۔ چولہے پر بگھار کی چھن چھن ہو رہی تھی۔ صحن کے دوسرے سرے پر کپڑے دھل رہے تھے۔ اندر کہیں باورچی خانے میں کل کی دعوت کے لیے نکالے گئے چینی کے برتن دھوئے اور پونچھے جارہے تھے اور ان سب اونچی نیچی، گمبھیر، باریک، اچھی، بری، گونجیلی، بے تال آوازوں پر نجمہ خاتون کی آواز حاوی تھی۔ کبھی مائی کو نمک مسر مسر کوٹنے پر پھٹکار، کبھی جھاڑو دینے والے ٹنڈے کو کوسنا اور کبھی اپنی ہی کسی غائب دماغی پر اپنا ماتھا کوٹنا۔"(۱۲)

فطری ماحول انسان کے لیے لازم شے ہے۔ یعنی انسان کے لیے جو اشیاء ضروریہ ہیں ان میں سرفہرست ماحول کو کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ماحول کا گلا گھونٹتا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ماحول جو انسان ازل سے اپنے رہن سہن کے لیے پسند کرتا آیا ہے اور جس آب وہوا میں رہنے کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے ایک خیالی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔

آمنہ مفتی اپنے ناول "جرات رندانہ" میں ماحول کے اس پہلو کو یوں پیش کرتیں ہیں۔

"اوائل فروری کی خنک ہوا اس کے چہرے سے مس ہو کر گزر رہی تھی۔ مغربی افق میں سورج ڈوبنے کی لالی جھلک رہی تھی۔ دور دور تک کوئی درخت نہ تھا۔ سیدھے سپاٹ کھیت، بھوسلی مینڈھیں اور تاحد نظر قالین کی طرح بچھی ہوئی گندم کے پودے جو ہر گزرتے جھونکے کا دامن تھامنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ ہی بہنے لگتے تھے اور جب وہ اٹھکیلیاں کرتا آگے گزر جاتا تو اگلی لہر کا دامن تھام لیتے۔ خاموشی لہر در لہر بہہ

رہی تھی۔ ہوا میں آتی بہار کی خوشبو تھی۔ ابھی ہوا سرد تھی مگر چند دن بعد یہ رہی سہی
سردی بھی رخصت ہونے والی تھی۔" (۱۳)

فطرت اور انسان کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ فطرت میں پائی جانے والی شادابی و ہریالی انسان کی روح تک کو سکون فراہم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ آمنہ مفتی بھی فطرت کا بہت قریبی مشاہدہ کرتی نظر آتیں ہیں اور اس کا ذکر اپنے ناولوں میں بہت خوش اسلوبی سے نبھاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا ہی دل فریب منظر جو انسان کو روح تک سرشار کر دے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"تیز زمستانی ہوا کے جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ نیچے وادی میں دور تک روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سب شجر و حجر برف میں اٹے ہوئے تھے مال روڈ کی طرف سے ٹریفک کا دھیما دھیما شور سنائی دے رہا تھا۔ ذرا دیر میں ہوا رک گئی اور برف گرنے لگی۔ ہلکی ہلکی پتی پتی برف پہلے سے گری ہوئی برف کی تہیں مضبوط کر رہی تھی۔"(۱۴)

موسم بہار کا ہو یا برسات کا ہر چیز کو سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔ تو پھر وہ چاہے سوکھ جانے والے تالاب ہوں، پہاڑوں کی چوٹیاں ہوں، سمندر، دریا یا ندی نالے ہوں سب کو ہی ایک نئی امنگ نئی زندگی نیا رنگ ڈھنگ مل جاتا ہے۔ پرندے بھی بہار و برسات کے جوبن میں اپنی خوشی کے اظہار کے لیے من موجی نغمے گاتے گنگناتے ہیں اور ان کے اس جھومنے گانے میں ان کے پروں، پنجوں کے ساتھ لگ کے آنے والے بیج یہاں وہاں گرتے اور پہاڑوں سے آنے والے پانی سے ان کی افزائش ہوتی ہے اور یوں وہ ایک دیس سے دوسرے دیس پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ہائے انسان جو اپنے ہاتھوں اپنے اس قدرتی ماحول کو برباد کرنے کے درپہ ہے اور پھر اپنے ہاتھوں اپنے کیے ہوئے نقصان پر افسردہ بھی ہے۔ ایسے ہی ماحول کا نظارہ آمنہ مفتی کروا رہی ہیں:

"برف گرتی رہتی ہے۔ گر گر کر پہاڑ سفید کر دیتی ہے۔ لگتا ہے اب برف کی حکمرانی ختم نہ ہو گی اور پھر زمین کروٹ لیتی ہے۔ برف پگھلتی ہے۔ سورج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تہہ در تہہ بے بسی سے بہتی ہے۔ زمین سے چمٹے رہنے کی خواہش میں پانی بن کر بہنے لگتی ہے۔ بہتی جاتی ہے۔ بہتے بہتے دریا بن جاتی ہے۔ کہاں کی مٹی کہاں پہنچ جاتی ہے اور پہاڑوں پر پھر برف پڑتی ہے، پھر چشمے پھوٹتے ہیں، پھر دریا ابلتے ہیں اور چشموں کے کنارے دور دیسوں سے آنے والے پرندے پنکھ دھوتے ہیں اور چہکتے ہیں اور بہار کے بنفشی پھول سبز گھاس کی پتیوں میں جگمگاتے ہیں اور بارش کی لڑیاں زمین آسمان، جل تھل سب ایک کر دیتی ہیں اور انسان اس دشت حیرت میں ایک بے حقیقت تنکے کی طرح کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آنکھیں پانی بن کر بہہ جاتی ہیں اور جیبھ اکڑ کر چمڑا ہو جاتی ہے اور آفتاب سوا نیزے پر آ پہنچتا ہے اور پکار پڑتی ہے اور استخوان کھڑ کھڑاتے ہیں"(۱۵)

آمنہ مفتی اپنے ناول "جرات رندانہ" میں ماحول کی خوب صورتی کو بیان کرتے ہوئے موسم بہار کا منظر نامہ اتنے دل فریب انداز میں کھینچتی ہیں کہ آج کا ہر انسان ایسے ہی ماحول کا خواہاں پایا جاتا ہے۔

"بہار "آشیانے" کے خوبصورت لانوں میں یونانی اساطیر کی کہانیوں کی طرح اتری ہوئی تھی۔ درختوں کے نئے چمکیلے پتے حیرت اور خوشی سے تالیاں سی بجا رہے تھے۔ موسمی پھلوں سے کیاریاں پٹی پڑی تھیں۔ سبز، سرخ، گلابی، ارغوانی، زعفرانی، چمپئی، پستئی، فاختئی، جامنی، کاسنی، پیلا، بسنتی، سرمئی، سیاہ، بھورا، شتری، قرمزی، زنگالی، نارنجی، فال سئی، انگوری، عنابی، ڈیڈھا گلابی غرض آپ نام لیجیے رنگ قطار باندھے کھڑے تھے۔ مصور قدرت نے اپنی صناعی کی تصویر خود بنانے کے لیے رنگوں کی کلیاں بھر رکھی تھیں۔ روز صبح نیلے چمکیلے آسمان پر بسنتی سورج پھوٹتا تھا۔ روز شام کو مغرب میں شفق پھولتی تھی اور چڑیاں اور رنگ رنگ کے پرند چمکیلے پتوں والے ہرے درختوں میں

نئے نئے گھونسلے بنائے حیرت کی شدت سے چہچہائے جاتے تھے۔ چوں چوں، چوں چوں، غٹر غوں غٹر غوں، پی ہو، پی ہو گاتے گاتے ان کے گلے پڑ جاتے تھے۔ "[16]

آمنہ مفتی اپنے ناول کے اس حصے میں اس دور کے ماحول کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتی دکھتی ہیں۔ جب ماحول ہر قسم کی آلودگی سے پاک صاف ہوا کرتا تھا۔ انسان کی خودکی کی گئی ایجادات نے ماحول کے اندر اپنا زہر نہیں گھولا تھا۔ جب پرندوں کے غول کے غول اڑتے دکھائی دیتے تھے اور درختوں پر اٹھکیلیاں کرتے پائے جاتے تھے۔

"مغرور مادائیں ایک ٹہنی سے پھدک کر دوسری ٹہنی پر اور دوسری سے پھدک کر تیسری ٹہنی پر اور نر ناچتے گاتے پر پھیلائے چونچ سے پر سلجھاتے ان کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور پھر ان سبز کاہی ہوتے پتوں میں مزید گھونسلے بنائے جاتے۔ رنگ برنگ انڈے سہہ کر نئے چوزے پیدا کیے جاتے تھے جو چوگا کھاتے کھاتے جوان ہو کر پھررر سے اڑ جاتے، یہ جانے بغیر کہ ان کے وجود میں آنے کے لیے قدرت نے دو دیوانے ماں باپ کو کیسے اس ناٹک میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ سویٹ پی کی بیلوں کے سامنے ایک مور پر پھیلائے ناچ رہا تھا اور اس کی معمولی صورت مادہ لاتعلقی سے دانہ کھا رہی تھی۔ " جھن۔ " مور نے زور سے اپنے پروں کو جھٹکا دیا۔ "[17]

آمنہ مفتی اپنے ناول میں موجود ہر خوشی غمی، سماجی واخلاقی اقدار، اعلیٰ کردار و کم ظرف افراد، اچھی و بری روایات تمام کے تمام عناصر کو اپنے عہد کی تاریخ سے منسلک کرتی ہیں۔ کیونکہ تاریخ اپنے اندر اپنے دور کی خوشی غمی، اچھائی برائی، درد و الم غرض ہر شے سمالیتی ہے قریب ایسے ہی حالات و واقعات کو وہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"چپس کا فرش دھوپ سے چمک رہا تھا۔ اندر کمرے میں باہر کی نسبت بے حد خنکی تھی اور اندھیرا۔ دروازے کے بالکل سامنے ایک بھاری پایوں والی ڈائننگ ٹیبل تھی جس پر گرائنڈر، پھلوں کے چھلکے، خوراک کے بند ڈبے، گلاس اور رنگ برنگی خالی بوتلیں

اور کین بکھرے ہوئے تھے۔ نشست کے حصے میں سفید اور نیلے چیک کے گدے دار
صوفے تھے جو اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ ان کے سپرنگ بیٹھنے والے کو پہلے ہی چیخ
کر خبر دار کر دیتے تھے۔"(۱۸)

آپ کے آس پاس ماحول کیسا ہے اور اس ماحول میں کس قسم کے انسان پائے جاتے ہیں ان پر ماحول کتنا کب اور کیسے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ایسے ہی ماحول کا نقشہ کچھ ان الفاظ میں کھینچتی ہیں:

"درمیانی میز کے نیچے غالیچہ تھا ہلکا انگوری جس پر بڑے بڑے آتشی گلابی پھول کھلے
ہوئے بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ ایک دیوار پر لائن سے گہرے آتشی گلابی اور سیاہ
رنگوں میں سات تجریدی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ساون کی رات جیساسیاہ گھور رنگ
اور اس سیاہی کے اندر سے پھوٹتا ہوا خواہش کا آتشی گلابی رنگ چنگھاڑتا ہوا، عجیب
عجیب قوسیں بناتا ہوا محراب دار راستوں سے گزر کر وجود کے اندر ہی اندر سرخ
راستوں پر دوڑتا ہوا چمکیلے ریڈ بلڈ سیلز کے ساتھ دال کی کال کوٹھری میں دھڑک
دھڑک دھڑک دھکے کھاتا رگ وپے میں پھیلتا احساس۔(۱۹)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں ماحول کی خوب صورتی کا تذکرہ جابجا کرتی ہیں اور ماحول کے وہ عناصر جو کبھی ہماری روایت و ثقافت کا حصہ تھے ان کو پیش کرتے ہوئے ان اشیا کا ذکر خیر بھی موجود ہے جو مصنوعی طور پر ہم نے ان قدرتی اشیا کی جگہ استعمال میں لا رکھی ہیں اور ان کے استعمال سے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ماحول کو خوب صورت بنا رکھا ہے۔ مگر یہ مصنوعی اشیا سے ملنے والی خوشی بھی عموماً مصنوعی ہی ہوتی ہے۔

"لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سفید چونے سے بنے دو کبوتر باریک باریک ڈنڈیوں
پر غالبا" قوت ایمانی" سے ٹکے ہوئے تھے۔ کھڑکی نیم وا تھی اور لان میں اگے ہوئے
بے شمار کیکٹس وہاں سے باخوبی نظر آرہے تھے۔"(۲۰)

یہاں آمنہ مفتی موسم سرما میں ہونے والی برف باری کے بعد موسم گرما میں اس برف کے پگھلنے اور اس سے دریا، ندی نالوں میں آنے والے پانی اور اس پانی کے سیراب کرنے سے اگنے والے درختوں، پھولوں، پھلوں اور اس ماحول کے منظر نامے کو دیکھ کر ہونے والی خوشی کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی اور ندی نالے اور جھرنے زوروں میں رواں تھے۔ڈھلانیں ڈیزی کے سفید سفید پھولوں سے اٹی پڑی تھیں اور چیڑ اور دیودار کے درختوں کے نئے نئے چمکیلے سوئی نما پتے بہار کی ہوا میں خاموشی سے لہرایا کرتے تھے۔[۲۱]

فطرت کا قانون ہے کہ اس نے ہر ذی روح کہ جو اس دنیا میں موجود ہے اس کے کھانے پینے کا انتظام کسی نہ کسی طور کر رکھا ہے اور اس کے لئے جو رزق مقرر کیا گیا ہے۔وہ کسی نہ کسی وسیلے سے اس تک پہنچ جاتا ہے۔اسی بات کا ذکر آمنہ مفتی ناول کے اس حصے میں اپنے ناول کے ایک کردار سے کرواتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> "گندم کی سنہری سنہری ڈھیری منڈی کے درمیان دیگر بڑے بڑے ڈھیروں کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور ننھی ننھی چڑیاں اپنی اپنی چونچیں بھر بھر کے لے جا رہی تھیں۔"میں کون ہوتا ہوں خدا کے عطا کیے ہوئے رزق میں سے لوگوں کا حصہ روکنے والا؟"منیر نے قلندرانہ شان سے سوچا اور گھر کی طرف چل پڑا۔"[۲۲]

انسان کے لیے ماحول اس کے عناصر، اس کی خوب صورت و دل کشی بہت معنی رکھتی ہے۔نئی نئی ہونے والی ایجادات کی وجہ سے جہاں ایک طرف زندگی بہت سہل ہو گئی ہے۔وہاں ہمارے ماحول کی خوب صورتی ایک خواب بن کر رہ گئی ہے اور انسان اپنے چشم تصور میں اس خوب صورت ماحول اور اس کے مناظر کو محسوس کرتا ہے اور اپنے تخیل میں اسی طرح کا ماحول تخلیق کرتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔کچھ ایسا ہی منظر آمنہ مفتی اپنے ناول میں پیش کر رہی ہیں۔

> "آواز کی فاختائیں لپک لپک کر چاروں اور بکھر رہی تھیں۔ننھی ننھی نرم و گداز دھڑکتے ہوئے ننھے ننھے دلوں والی فاختائیں۔ساون کی گھور اندھیری رات میں رکے

ہوئے کڑے حبس میں کبھی کبھار ٹپک پڑنے والی بوند کا ارتعاش پھیلاتی ہوئی خوبصورت آواز سارے کمرے میں غبار کی طرح چھائی ہوئی تھی"(۲۳)

ماحول اور فطرت کی دل کشی و دل فریبی کا ذکر کرتے ہوئے آمنہ مفتی ہمیں اس بات کا احساس بھی دلاتی نظر آرہی ہیں کہ ہم نے زمین اور اپنے ماحول کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا ہے۔ مگر پھر بھی زمین نے اپنی پیداوار میں کمی نہیں کی ہے اور انسان اس سے بار بار اپنی ضرورت کے مطابق لے رہا ہے مگر کبھی بھی زمین نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ اتنا دینے کے بعد بھی کہ اب وہ بالکل خالی ہو چکی ہے۔

"ہرے ،کاہی، بھوسلے ،زرد کھیت ہی کھیت اور ان کھیتوں سے آگے بھی کھیت ہی کھیت۔ کیا چھپا ہے ان کھیتوں میں ؟اور کیا ہے کہ ان کی گود کبھی خالی نہیں ہوتی ؟ جھولیں بھر بھر لیے جاؤ،زمین کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے اور کیسا ہے گندم کا خمار کہ پیٹ بھرے کی چال ٹیڑھی ہی ہوتی ہے۔"(۲۴)

انسان نے اپنے ہاتھوں سے کی گئی ایجادات سے سطح زمین کو بہت زیادہ نقصان پہنچا دیا ہے۔ مگر قدرت کی عطا کردہ یہ خوب صورت نعمت جسے زمین کہتے ہیں۔ جو ماحول کا ایک اہم عنصر ہے۔ انسان کے اس قدر ستم کو بھی خاموشی سے سہہ جاتی ہے اور انسان کو اپنے سینے سے نت نئی، انواع واقسام کی کھیتیوں سے جو جو وہ اس میں بوتا ہے اس کے پھل سے نوازے جا رہی ہے اور حضرت انسان اس سب سے سیر ہو کر پھر ناشکرے پن سے زمین کو مزید نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا پایا جاتا ہے۔

ج۔ "آخری زمانہ" کا تعارف:

آخری زمانہ آمنہ مفتی کا دوسرا ناول ہے۔ جو 2010ء کو الفیصل ناشران نے لاہور پاکستان سے شائع کیا۔ " آخری زمانہ " کے کل 557 صفحات ہیں اور ابواب کی کل تعداد 97 ہیں۔ آمنہ مفتی کا یہ دوسرا ناول "آخری زمانہ" "آخری زمانے کے انسان کے نام ہے۔ اس انسان کے نام جو جنگ کا مہرہ ہے۔ قاتل ہے مقتول ہے، ظالم ہے مظلوم ہے جو کھو چکا ہے، مفرور اور مطلوب ہے۔ اسی انسان کے نام۔" آمنہ مفتی کے دوسرے

ناول "آخری زمانہ" کی کہانی کی بنت اور کرداروں کی جب بات کرتے ہیں تو اس ناول کے مرکزی کردار خالد اور راحیلہ کے ساتھ ان دونوں کرداروں کے خاندان کے افراد کے ساتھ معاشرے میں موجود دیگر لوگ بھی گاہے بگاہے ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں ہمارے معاشرے میں یکے بعد دیگرے ہونے والے حالات و واقعات اور ان واقعات کے ہمارے ماحول پر ہونے والے اثرات اور پھر اس ماحول کے پروردہ انسانوں کے حالات کو بہت باریکی سے بیان کیا گیا ہے۔ صرف ان حالات کو ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں جو خانہ جنگی کیفیات اس وقت میں پائی جا رہی تھیں ان کا احوال بھی رقم طراز ہے۔ ناول "آخری زمانہ" میں آمنہ مفتی نے امریکہ میں ہونے والے 11/9 دھماکے اور ان کے بعد کی فضا اور اس کے مسلم دنیا اور خاص کر افغانستان پہ مرتب ہونے والے بھیانک اثرات اور ان تمام حالات کے پیش نظر جو ماحول کی حالت دگرگوں ہوئی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ آمنہ مفتی کے دوسرے ناول "آخری زمانہ" پہ کئی لوگوں نے تبصرے کیے ہیں۔ ایسا ہی ایک تبصرہ "ہم سب" کے گوشہ ادب میں زاہد حسن نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اپنے اس ناول میں آمنہ مفتی نے ہمیں ایک تصویر دکھائی ہے۔ ہو بہو آخری زمانہ، کے جیسی۔ ایک ہی گھر، ایک ہی خاندان، ایک ہی شہر اور ایک ہی ملک میں رہتے بستے "کردار" ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، جھوجھتے، ایک دوسرے سے فکری، سماجی اختلاف اور تضاد رکھتے، ایک ایسی زندگی کی تلاش میں ہیں جس کا حقیقی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق کوئی سمبندھ نہیں بنتا۔"(۲۵)

ناول کے آغاز کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "ناول خوب صورت منظر بناتا ہوا ایک منفرد دیہاتی بیانیے سے شروع ہوتا ہے۔ گاؤں کی گلیوں میں گنے کے چسے ہوئے چھلکے تھے، اور چاندنی، کہرے میں ٹھٹھرے ہوئے درختوں اور اوس نچڑتی دیواروں کے سایوں کے درمیان موزائیک بنا رہی تھیں۔ تہذیبی رنگا رنگی میں ایک دم جلسے جلوس نکلنے لگتے ہیں، نعرے اور تقریریں ہونے لگتی

ہیں، مدرسوں میں درس ہونے لگتا ہے۔۔یونیورسٹیوں میں سیکولرازم پنپنے لگتا ہے۔"(۲۶)

جمہوریت، سیاست، سماجی حالات اور قانون کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک طرف حکومت بنانے، فوری انصاف کی فراہمی کے فیصلے کرنے کے اختیارات کے حصول کی "ضدیں" جڑ پکڑنے لگتی ہیں، دوسری طرف طبل جمہور پر آئینی تھاپ پڑتی ہے۔ فیصلوں کے درمیان فاصلے آنے لگتے ہیں، تبھی زور زبردستی کا قانون جڑ پکڑنے لگتا ہے۔ ریاست "مجموعہ اضداد" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دھماکے، دہشت و وحشت اور بربریت جابجا اپناراج قائم کر لیتے ہیں، انہی میں سے طلوع ہوتا ہے "آخری زمانہ" جو آمنہ مفتی کا ناول بھی ہے اور دنیا کے لیے ایک علامتی الارم بھی"(۲۷)

ایسے ہی ناول کے کرداروں اور اہم واقعات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سارہ، راحیلہ، جانس، دادی جمیلہ، رحیم گل، جنید بغدادی،، خالد، دابو اور دہلوی سمیت دیگر بے شمار کرداروں کی کہانی آخری زمانہ کی جانب بڑھ رہی ہوتی ہے کہ عین بیچ میں یعنی صفحہ نمبر 324 پر نائن الیون ہو جاتا ہے ناول کے ایک کردار تہور علی خان کے ذریعے پتہ چلتا ہے۔ جانے نائن الیون نے کسی جناتی ٹائم مشین کا بٹن دبا دیا تھا اور ساری دنیا قرون وسطی کے جنگ جو اور وحشی دور میں لوٹ گئی تھی۔"(۲۸)

ناول کو چند ہی الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے زاہد حسن لکھتے ہیں:۔

"آمنہ مفتی نے ہمیں چاروں سمت سے یلغار کرنے والوں کے ارادوں اور عزائم سے روشناس کرا ڈالا۔ عین اسی طرح جیسے ہماری ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کی کوئی سمت کوئی منزل متعین نہیں۔ ان ارادوں اور عزائم والوں کی سمت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پڑھنے لکھنے اور سوچنے والے اپنے زمانے کی کمین گاہوں میں بیٹھے ان لوگوں کو "آخری زمانہ" سے گزرتے دیکھ رہے ہیں"(۲۹)

د۔ "آخری زمانہ" میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیہ:

"آخری زمانہ" میں آمنہ مفتی ماحولیاتی عناصر کا تجزیہ بہت خوب صورتی سے کرتی پائی جاتی ہیں۔ وہ ناول کے کرداروں کو درپیش مسائل اوران کے حل، ان کی نفسیات، ان کے دکھ سکھ، ان کے کمالات، ان کے ہنر، ان کے تجربات، ان کے ہاتھوں سرزد ہونے والے ماحول کے مزید مسائل جو ماحول کو دن بدن تباہی کی جانب لے جارہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ماحول میں پائی جانے والی خوب صورتی کو بھی قارئین کے سامنے لاتی ہیں، بتاتی ہیں، دکھاتی ہیں۔ ایسے ہی خوب صورتی جو ہمارے دیہاتی ماحول کا خاصہ ہے اس کے ایک منظر کو اپنے قلم سے الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "بجھے ہوئے چولہے کے پاس بیٹھی بلی نے بڑے حکیمانہ انداز میں صحن میں بیٹھے چاروں نفوس پر نظر ڈالی اور اپنے اگلے پنجوں میں منہ چھپا کر بچی کھچی دھوپ سینکنے کو سورہی۔"(۳۰)

آمنہ مفتی ماحول میں موجود اشیا، جانور، چرند، پرند غرض ہر وہ چیز جو اس ماحول کا حصہ ہے اور اس وقت لوگوں کے کیا حالات وواقعات ہیں اور ان حالات کی وجہ سے ماحول کیسے جان داروں پر اثر انداز ہوتا ہے کے بارے میں بے حد باریکی سے بیان کرتی ہیں۔ گاؤں میں رہنے والوں کے گھر گرہستی کیسی ہوتی ہے۔ وہ کیسے اپنا جیون گزارتے ہیں۔ ان کا رہن سہن کیسا ہوتا ہے۔ گھریلو حالات وماحول کیسا ہوتا ہے۔ ہر ہر چیز کو بہت ہی صفائی سے منظر پہ پیش کرتی ہیں۔ ایسے ہی ماحول کا ذرا سا نمونہ ان کے ناول "آخری زمانہ" میں کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ لکھتی ہیں:

> "دیوار کے ساتھ پھونس کے چھپر کے نیچے مٹی کا چولہا تھا۔ چار چھ ضرورت کے برتن یہیں چھپر کے نیچے رکھے تھے اور باقی اندر گنجینے میں اور کارنس پر تانبے کے بادیے، تام چینی کی پھولدار رکابیاں اور دیسی چینی کے چند ایک پیالے۔ چھپر سے ذرا ہٹ کر نلکا تھا اور وہیں کونے میں دیواروں کی آڑ میں مخدوش سا غسل خانہ پھر مغربی دیوار

کے جہاں دو چھوٹی کوٹھڑیاں اور ایک ننھا سا برآمدہ۔شمال میں بیٹھک تھی اور
دروازہ۔"(۳۱)

گاؤں میں رہنے والے معصوم اور کھرے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے راز ہوتے ہیں ان سب کے اور ان ہی رتی برابر چیزوں سے ان کی بڑی بڑی خوشیاں وابستہ ہو جاتی ہیں اور ان کے غم ہوں یا خوشیاں ان ہی سب سے جڑی ہوتی ہیں اور ان سب کا ان کے ماحول پر بے حد اثر پڑتا ہے اور یہ تمام لوگ اپنے ماحول کا اور ان میں موجود ذی روحوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں اور اس فریم کو آمنہ مفتی نے اپنے ناول "آخری زمانہ" میں یوں رقم طراز ہیں:

"بڑے سے کھلے صحن والا پکا گھر، جس میں نیم کا درخت تھا اور مرغیوں کا کھڑا۔ کھڑے کے پیچھے ایک ہاتھ بھر کی درز جو اماں کا اور اس کا مشترکہ راز تھی۔ یہاں وہ ہر وہ شے رکھتا تھا جو اسے ساجد اور شاہد سے چھپانی ہوتی تھی۔ پکے کمرے، جن میں لمبی لمبی کارنسوں پہ اماں کے ہاتھ کے کڑھے سفید کپڑے پڑے ہوئے تھے اور لال پایوں والے پلنگ جو اینٹوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اتنے اونچے پلنگ جن پہ چڑھنے کے لیے اسے بڑی کوشش کرنی پڑتی تھی اور اماں کے جہیز کی پیٹی جس پہ ساجد اور شاہد کے بستے اور وردیاں رکھی ہوتی تھیں۔"(۳۲)

انسان کے ارد گرد کا ماحول اس کے جذبات و خیالات اور زندگی پر بے حد اثر انداز ہو رہا ہوتا ہے اور اس وقت جب باہر کے ماحول کے ساتھ ہی ساتھ اندر کا ماحول بھی خوشیاں اور نئے خواب لیے ہوں تو ہر طرف زندگی رقص کرتی ہے۔ایسے ہی خوشیوں سے لبریز کچھ لمحے آمنہ مفتی اپنے ناول "آخری زمانہ" کے صفحہ قرطاس پر بکھیرتی ہیں:

"گندم اور سرسوں کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے خالد نے دیکھا کہ اماں اور ابا دونوں سرگوشیاں کر رہے ہیں ابا نے اماں کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور سونے کی بالیوں کے عکس سے اماں کے چہرے پہ عجیب بہار آئی ہوئی تھی۔"(۳۳)

آمنہ مفتی اپنے ناولوں میں اکثر اس ماحول کو دیکھاتی پائی جاتی ہیں۔ جو آج کے دور میں خال خال ہی دکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن وہ اس وقت اور ماحول کو جس کو وہ خود کبھی جیتی رہی ہیں اور آج بھی تمنا رکھتی ہیں کہ ہمارے آس پاس وہی ماحول ہو، اس کا برملا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "داہنی طرف بکائنوں کی قطار تھی

سامنے لان تھا۔ گھاس، روشیں، گلابوں کی کیاریاں اور گل چین کے درخت اور سرو اور مور پنکھ کے پر اسرار درخت اور چاندنی "[34] آمنہ مفتی اپنے ناول میں زمینی ماحول اور اس کا انسان سے تعلق کے ساتھ ہمارے ارد گرد پائے جانے والے سیاسی و معاشرتی ماحول کو بھی باخوبی بیان کر جاتی ہیں:

> "بیٹھک گرم تھی۔ آتشدان میں کوئلے تھے اور سیمنٹ کے کارنس پر ٹائم پیس کے ساتھ ایک قلمدان رکھا ہوا تھا۔ فرش پر دری تھی اور بھاری پایوں والے صوفے دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں لکھنے کی میز کرسی تھی اور کرسی کی پشت پر قائد اعظم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میز پر بھی نو ستاروں والا جھنڈا اسٹیل کے اسٹینڈ پہ لگا ہوا تھا۔ "[۳۵]

اپنے ناول " آخری زمانہ " میں آمنہ مفتی ناول کے کردار خالد کے ذریعے ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے نام نہاد سرکاری اسکول ان کی عمارات ان اسکولوں میں پائے جانے والے اساتذہ کرام اور ان سب کی وجہ سے معصوم ذہنوں پر نقش ہونے والے اس ماحول کے خطرناک اثرات کو دور حاضرہ سے ہم آہنگ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "اسکول کی عمارت کافی بڑی اور کسی حد تک ویران محسوس ہوتی تھی۔ آدھا زمین میں دھنسا آہنی گیٹ جو شاید ہی کبھی بند ہوتا ہو گا۔ سیم زدہ نیم ادھڑا اکھڑ نجے کا فرش جس پر چلتے ہوئے قدم قدم پر ٹھوکر کا احتمال رہتا تھا۔ بڑے بڑے کھیل کے میدان جن میں خود رو جھاڑیاں قد آدم گتھی کھڑی تھیں اور جھاڑیوں میں بھٹ تیتر، نیولے، گھگھیاں اور گرگٹ رہا کرتے تھے۔ "[۳۶]

" آخری زمانہ " میں آمنہ مفتی خالد کے اسکول میں پائی جانے والی تمام اشیاء کو ایک مکمل ترتیب کے ساتھ پیش کرتی اور پھر ان تمام کا ہمارے ماحول سے کیا تعلق واسطہ ہے اور اس ماحول کا ان بچوں پر کیا اثر آنے والا ہے اس کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

> "احاطے کی ڈھیتی ہوئی دیواروں کے ساتھ اکاں کے منحوس درخت کھڑے پر اسرار انداز میں ہلتے رہتے تھے اور ان کے سوئی نما پتے میلے میلے کاہی اور بھورے رنگ میں رنگے نظر آتے تھے۔ ایک دو کیکر اور ٹاہلی کے آڑھے ٹیڑھے، بے ڈھنگے درخت بھی تھے۔ صرف دہنی طرف ایک قطار میں آٹھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے

آگے نیچی چھت والا بر آمدہ پڑتا تھا۔ کمرے خوب کھلے اور ہوادار تھے۔ فرش پر ٹاٹ بچھے ہوئے تھے اور چونکہ پڑھائی کا گھنٹہ تھا، ہر جماعت سے مختلف لے اور سر میں سبق دہرانے کی ایک سی کوفت میں مبتلا کر دینے والی آوازیں ابھر رہی تھیں۔"(۳۷)

آمنہ مفتی ہمارے گرد و پیش میں پائے جانے والے ماحول اور اس میں بسنے والے انسانوں کے باہمی تعلق واسطے کو ایک دوسرے سے باہم ملاتے ہوئے اس دور میں موجود حالات کیسے تھے کیا ہو رہا تھا ہر چیز کو بیان کرتے ہوئے فضا میں اڑتے، چہچہاتے، رقص کرتے، خوشی کا اظہار کرتے پرندوں کو بھی موضوع بحث بناتیں اور اس کی بھرپور عکاسی بھی پیش کرتی ہیں۔

"ان کے چاروں طرف مینائیں، فاختایئں، کبوتر اور ہد ہد پھدکتے پھرتے تھے میناؤں کا ایک جوڑاتو ان سے اس قدر مانوس تھا کہ ان کے تخت پر پھدکتا پھرتا تھا۔
"آہ، آ، آجاؤ" وہ سانتا کلاز کی سی خوب صورت اور شفیق مسکراہٹ لیے آٹے کی ننھی ننھی گولیاں پرندوں کو ڈالتے رہتے تھے۔"(۳۸)

فطرت کے خوب صورت رنگ اور ان رنگوں کا ذکر آمنہ مفتی کے ناولوں میں ہمیں اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ قدرت کے بے حد حسین نظارے اور اللہ کا بے حد خاص کرم ہے ہم انسانوں پر کہ ہمیں اشرف المخلوقات بنایا یہ ہی نہیں بلکہ اپنی رحمت کا سایہ ہم پہ ہمیشہ تانے رکھا جہاں ہم ذرا سا کسی بوجھ تلے آئے۔ تو اللہ اپنے فضل و کرم سے ان مشکلات کا کوئی وسیلہ بنا کر اس سے نکال دیتے ہیں۔ ایسے ہی حالات کو ناول میں بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"کبوتر دانہ کھاتے کھاتے اپنی گردنیں اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا کرتے تھے اور پھر مگن انداز میں دانہ کھانے لگے۔ آسمان کا وہ ٹکڑا جو اس گھر پر تنا ہوا تھا رحمتوں اور شفقتوں کا منبع تھا۔ خدا بہت رحیم تھا بہت قریب تھا، شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک، ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرنے والا اور اس خدا کا فرستادہ مرد حق اس سلطنت خداداد کا محافظ بن گیا تھا۔"(۳۹)

آمنہ مفتی نے اپنے ناول میں ماحول کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے اس میں انسانوں کے رہن سہن کے ساتھ وہ ماحول جو ہم لوگوں کی ذات کے لیے لازم وملزوم بن جاتا ہے اس کو بھی عکس بند کرتے ہوئے نہ صرف مکینوں بلکہ دیگر چرند پرند کی رہائش و سرگرمیوں کے بارے میں بھی قلمبند کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

"ان روشن دانوں میں اللہ جانے کہاں کہاں سے آکے کبوتر اور فاختائیں اور مینائیں اور گلہریاں رہنا شروع ہو گئی تھیں۔ گلہریاں سارا دن چرر چرر کرتی چھجوں پر دوڑتیں۔ باورچی خانے کی سلاخ دار کھڑکی سے اندر گھس کر چھان بورے کے ڈرم سے روٹی کے ٹکڑے چھانٹ، چھانٹ کر کھاتیں اور باقی وقت دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں سے گودڑ کھسوٹ کر اپنے گھونسلے بناتیں۔ فاختائیں کڑی دوپہروں میں خون خشک کر دینے والی آوازوں میں "ہوں، غوں، غوں" کیا کرتی تھیں۔"(۴۰)

ناول آخری زمانہ میں ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے آمنہ مفتی نے اپنے کرداروں کے جملہ حالات کے ساتھ وہ کب، کہاں، کیسے اور کتنے تہذیب یافتہ دور کا حصہ رہے ہیں ان سب کا تذکرہ کرتی اور ان کو بنتی دکھائی دیتی ہیں کہ ہمارے چاروں طرف کیا کچھ پایا جاتا ہے اور ہم اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں:

"وہ ایک کشادہ سی چوک نما جگہ پر کھڑا تھا۔ دراصل یہ کوئی چوک بھی نہ تھا بلکہ ایک پختہ میدان سا تھا۔ جس کے چاروں طرف سبزی کی دوکانیں تھیں۔ بڑی چھوٹی۔ کسی دکان کے سامنے بوریوں کے ڈھیر تھے۔ کسی کے آگے کینوؤں کی دھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ کسی کے آگے پلیوں میں بندھے مونگرے دھرے تھے تو کوئی ساری موسمی سبزیوں سے پٹی پڑی تھی۔ ان دکانوں کے آگے شہتوت کی چھڑیوں کی بنی مختلف حجم اور وضع کی بے شمار ٹوکریاں ادھر ادھر رکھی تھیں اور کچھ مزدور صورت لوگ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔"(۴۱)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں ماحولیاتی عناصر کو بیان کرتے ہوئے اس ماحول کے پروردہ کرداروں ان کے حالات خیالات اور ان کا اپنے، ماحول کے ساتھ کیسا رشتہ ہے اور مشکل پڑنے پر انسان کیسے ان تمام من گھڑت توہمات کو پس پشت ڈال کر اس ماحول کا ہی پروردہ بن جاتا ہے اور اپنے آپ کو ان ہی میں محفوظ سمجھتا ہے۔ ایسے ہی ناول "آخری زمانہ" میں موجود کردار خالد کو جب راحیلہ اور اپنے باپ سے ڈر لگتا ہے۔ تو وہ ان ہی

درختوں کا چھپنے کے لیے استعمال کرتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان پر جنات ہیں پیچھل پیری وغیرہ پائی جاتی تھی۔

"خالد باپ کا ہاتھ چھڑا کے بھاگا اور ایسا بھاگا کہ دو کلے بر سیم چوکڑیوں میں عبور کیے اور امرودوں کے باغ میں جا چھپا۔ باغ علی آوازیں دیتا پیچھے آیا تو وہاں سے بھی بھاگ کر آگے آم جامنوں کے کنج میں جا چھپا۔ یہیں وہ بیری تھی جس کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں مشہور تھیں۔ خالد عین اس بیری کے ساتھ والے درخت پر چڑھ کر چھپ گیا۔ جان پہ بن آئے تو بندریا پیروں کے نیچے بچہ رکھ لیتی ہے خالد تو پھر انسان تھے جانتے بوجھتے کیسے جنوں کے مسکن میں دوبارہ چلا جاتا؟"(۴۲)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں ماحول میں موجود خوب صورت مناظر جو ان کی زندگی کا اثاثہ رہے ہیں ان آنکھوں دیکھے مناظر کو ایسے قلم بند کرتی ہیں گویا آج بھی ماحول میں وہی سب کچھ موجود ہیں اور وہ ماحول آج کے انسان کی زندگی میں اب بھی موجود ہے۔ ایسے ہی ایک منظر کی عکس بندی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"آم کے کنج میں خنکی تھی اور بہار کی خوشبو۔ ابھی بور نہیں آیا تھا۔ جامن کے گھنے گھنے درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ٹہنیاں اتنی گتھ گئی تھیں کہ کہیں کہیں تو لگتا تھا روشنی کا بالکل گزر نہیں ہے۔ آگے ٹاہلیوں کا ذخیرہ تھا جو کہرے سے مارا گیا تھا"(۴۳)

فطرت اور انسان کا آپسی واسطہ بہت گہرا ہے۔ انسان کو اس کے آس پاس پائے جانے والے فطرت کے پر نور نظارے متاثر کرتے ہیں اور وہ ان ہی کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک نظارے کو آمنہ مفتی اپنے ناول میں پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں: "سامنے دور تک گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ انجیروں سے پرے اور ان کھیتوں میں بیری والا کھوہ تھا اور سورج ان سب چیزوں سے کہیں دور اوپر چمک رہا تھا"(44) آمنہ مفتی کا قلم بہت ہی برق رفتاری سے چلتا ہے اور اسی چلتے قلم سے وہ اپنے خیالات کو قاری کے سامنے کے لا کھڑا کرتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں یہ بہت نمایاں وصف ہے۔ کہ وہ ماحول میں موجود فطرت کی شادابی و ہریالی کو بہت اعلی انداز سے دکھاتی ہیں:

"کھیتوں میں موسم کی فصل لگی ہوتی اور مینڈھوں پر ٹیٹریوں کے گھونسلے ہوتے اور بگلے درختوں پہ بیٹھے نہری پانی کے کھالوں کو حریص آنکھوں سے تاک رہے ہوتے اور گوہیں اور جھاؤ چوہے، اس کی آہٹ پا کر بھدر بھدر بھاگ جاتے۔"(۴۵)

آمنہ مفتی اپنے ماحول اور اس کے عناصر سے ایک خاص روحانی و قلبی رشتہ استوار کر لیتی ہیں اور یہ ہی رشتہ پھر ان کے ناولوں میں بھی دکھتا ہے۔ نہر کا وہ کنارا جہاں ڈھیروں کی تعداد میں درخت پھول پودے ہوا کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان درختوں کا کٹاؤ کیا جا رہا ہے اور نئے درخت لگانے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ پرندے جو کبھی ان درختوں پر گیت گایا کرتے تھے اب وہ بھی ناپید ہوتے جا رہے ہیں اور درخت بھی منظر سے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک منظر جس میں نہر کنارے لگائے گئے درختوں کا صفایا بڑی صفائی سے کیا جا رہا ہے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"یہاں نہر کا پاٹ بے حد چوڑا تھا اور درخت بالکل بے برگ و بار۔ نہر کے کنارے کٹاؤ کے باعث کٹے پھٹے تھے۔ ٹاہلی کے درختوں کی چھنگائی کی جاتی رہی تھی، پھر دیہاتیوں نے ان کی چھال تک اتار ڈالی تھی۔ ایک سو اٹھاون، ایک سو اکیاون، ایک سو انسٹھ، درختوں پر نمبر کھدے ہوئے تھے۔ درمیان سے کچھ درخت غائب تھے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں یہ درخت سفید پڑ گئے تھے۔ جیسے درختوں کے بے روح بدن۔"(۴۶)

انسان کی اپنے ہاتھوں سے کی جانے والی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ہمارا ماحول اور اس کے عناصر متاثر ہو رہے ہیں۔ ہم خود اپنے ہاتھوں سے درختوں کا صفایا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ہماری آب و ہوا بلکہ اس کے علاوہ دیگر چرند پرند بھی اپنی نسلوں کا قیمتی سرمایہ کھوتے جا رہے ہیں۔ ایسے ہی حالات کا ایک حوالہ آمنہ مفتی اپنے ناول میں دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ہوا کا ایک خشک سرد جھونکا بے برگ و بار درختوں میں سے گزرتا ہوا ان کے چہرے پر گرد کی ہلکی سی تہہ جما گیا۔ نہر کا پانی ترل ترل بہا کیا، ایک نیل کنٹھ زور زور سے چلاتا ہوا ان کے اوپر سے گزرا اور دوسرے سرے پر اگی، جھاڑیوں میں جا گھسا۔ سرخی مائل

پانی اسی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا، سب اسراروں کو، سارے بھید اس کے آگے کھلے تھے۔ مگر وہ خاموش تھا، بے حد طاقتور تھا اور جب غیظ میں آ کر چنگھاڑتا تھا تا آس پاس کی بستیوں کو غارت کر دیتا تھا۔ اس وقت بڑے امن و سکون سے بہہ رہا تھا۔"(۴۷)

آمنہ مفتی اپنے کرداروں کے وہ دور / عہد جو وہ گزار چکے ہیں ان کو تو پیش کرتی ہی ہیں۔ جس میں گزشتہ دور میں پائی جانے والی ماحول کی رنگینی اور فطرتی حالات اور ان سے جڑی یادیں بھی بیان کرتی ہیں۔ ایسے ہی اپنے ناول میں لکھتی ہیں:

"گاؤں ویسا ہی تھا وہ بدل گیا تھا۔ وہ درخت جو بہت بڑے لگتے تھے اور جن کی پھننگیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اب بونے سے لگ رہے تھے۔ کچی مٹی کی پٹھانی دیوار جو دیوار چین کی طرح طویل اور بلند محسوس ہوتی تھی۔ ایک مخدوش سی کچی حدبندی تھی جس نے گاؤں کی چند گھروں پہ مشتمل آبادی کو گھیرا ہوا تھا۔"(۴۸)

آمنہ مفتی لکھتی ہیں کہ انسان جب اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ کسی تہذیب یافتہ اور ماحولیاتی عناصر سے بھرپور انداز میں گزارتا ہے تو وہ اس بات کا اندازہ لگا چکا ہوتا ہے کہ اس کا حال بے وقعت، کھوکھلا، بدتہذیب اور بے معنی ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں ہم اعلیٰ کلاس کے چکروں میں اپنی تہذیب و ثقافت کی خوب صورتی اور شادابی کو پس پشت ڈال کر اپنے ہی نقصانات میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔

"اس کوٹھی میں وقت بہت تیزی سے گزرتا تھا۔ گاؤں والے گھر میں تو یہ وقت بھورے رنگ کا ایک بڑا سا بلاک بن کر سر پہ لٹکتا رہتا تھا۔ راحیلہ سفید گلابوں کی بیل کے نیچے کھڑی مالی سے جھگڑ رہی تھی۔ "سارے شہر کے پینڈو پودے، گیندا، گلاب، چنبیلی، بھئی یہ سارے ہمارے گھر کے لیے رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا تھا کہ ایروکیریا لاؤ، سامنے اشوکے لگاؤ، ادھر بوتل پام، تم نے یہ کیا بنا دیا۔ ایک مہینے کے لئے گئی تھی میں، مر تو نہیں گئی تھی۔ یہ دیسی گلاب، یہ گیندا اور یہ کلغا، پھینکو ان سب کو باہر، چلو پھینکو" طوطا پنجرے میں اداس بیٹھا تھا۔ بی بی جی جمعدارنیکے سر پہ کھڑی

پورچ میں لگے ڈیزل کے دھبے چھڑوا رہی تھی اور میاں جی اندر نئی نئی لگی ڈشپر BBC دیکھ رہے تھے۔"(۴۹)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں کئی جگہوں پہ ماحول کا وہ منظر پیش کرتی ہیں جو ان کے دل و دماغ میں خیالات میں موجود ہوتا ہے اور اس خیال کا حقیقت کے ساتھ گہرا تعلق بھی موجود ہوتا ہے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"نیلا، بے کراں، بلند آسمان جہاں نگاہوں کی پہنچ سے کہیں آگے، جبرئیل کی طاقت پرواز سے بھی آگے اور شہ رگ سے بھی نزدیک خدا ہے۔ کہاں؟ دیکھو تو لوح محفوظ پہ لکھ دیا گیا تھا اور وہ ہو گیا تم اور تمہارے جیسے لاکھوں ہزاروں کس گنتی میں ہو؟"(۵۰)

آمنہ مفتی اکثر و بیشتر اپنے ارد گرد کے ماحول اور اس میں پائے جانے والے کرداروں، اشیا، ثقافت، ماحولیاتی عناصر سب کے سب پر گہری نظر رکھتی ہیں۔

"سفید لیس کے پردے، گلابوں کے موتیف والے کشن، گلابی، سفید، ہلکے زرد اور کاسنی رنگوں کی چادریں، مدھم روشنیاں اور چھوٹے سے لاؤنج میں ایک کونے میں رکھا الیکڑک کی بورڈ۔ دیواروں پر آپی کی شادی کی تصویریں تھیں۔ مانگ پٹی، نتھ، بالے، جھالے، جڑاؤ چوکر، سرخ دوپٹہ، کچھ لوگوں کو خدا کتنا حسین بنا دیتا ہے۔"(۵۱)

اپنے ناول "آخری زمانہ" میں موجود کردار راحیلہ جو ملک کے سیاسی ماحول میں ہونے والی تبدیلی کا سن کر کچھ دیر کے لیے حیران پریشان ہو جاتی ہیں اور اپنے ارد گرد دیکھتی ہیں کہ کیا کچھ تبدیل ہوا ہے اور کیا کچھ ویسا ہی ہے اور جب سب کچھ پہلے جیسے ہی ہے تو یہ تبدیلی کیسی اور کیوں آئی ہے تو اس کا مقصد کیا ہے۔

"راحیلہ نے آنکھیں ملیں، چاروں طرف وہی منظر نامہ تھا۔ کلمہ چوک کا خوب صورت مینار، ہری گھاس، نئے ماڈل کی گاڑیاں، بے فکرے لڑکے، توندیل ٹریفک کے سپاہی اور بھنکتے ہوئے فقیر بچے۔ سب کچھ وہی تھا جو اس کے پنڈی جانے سے پہلے تھا۔ پھر انقلاب کیسے آ گیا؟"(۵۲)

فطرت اور انسان کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق آمنہ مفتی کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ کیسے ماحول انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ چیزیں جو گزرے وقت میں اس کے لیے ڈر یا پریشانی کا باعث بن رہی تھیں وہی تمام اشیا انسان کے آج میں بالکل بدل کر رہ گئی ہیں۔ اب نہ تو وہ ان سے خوف زدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے وہ اب کچھ ان ہی معنوں میں موجود ہے۔ بس اس کو ایک ہی بات ستاتی ہے کہ آج کا انسان بدل کے رہ گیا ہے۔ پہلے جو خلوص، محبت اور اپنائیت رشتوں، ناتوں میں پائی جاتی تھی۔ اب مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے ہی حالات کو پیش کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

> "خالد نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا کھیتوں میں، نہر کی پٹری پر، راجباہ پہ درختوں کے کنج میں، کبھی شہر میں، وہ اپنے بچپن کے راستوں پر گھومتا اور پرانی چیزوں کو نئی حیرت سے دیکھتا۔ ہر شے اب معنی بدل گئی تھی۔ شوگر مل کے دود کش اب پہلے جیسے خوف ناک نہیں لگتے تھے۔ چوہے، ٹیٹر اور گوہیں اب بھی اسی طرح کھیتوں کی مینڈھوں اور نالوں میں بھاگے پھرتے تھے۔ بس آدم زاد ہی بدل گیا تھا۔"(۵۳)

ہمارے ماحول میں پائی جانے والی فطرتی رنگینی اور شادابی جو کبھی ہمارے ہاں ماحول کا ایک لازمی جز قرار دی جاتی تھی اور ہمارے دیہاتوں میں شام کا ایک بہت ہی خوب صورت منظر ہوتا تھا۔ جس میں آسمان پر موجود چاند سے لے کر زمین پہ پائے جانے والے انسانوں کے لیے دن بھر کے تھکن زدہ ماحول کے بعد ان کے گھروں کا آسودہ و آرام دہ ماحول جو ان کی تھکن کو اتار کر ایک خوشی اور شادابی کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ ایسے ہی ماحول کا پرچار آمنہ مفتی اپنے ناول "آخری زمانہ" میں کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "آسمان پہ پتلا سا چاند نکلا ہوا تھا۔ ساتھ والے گھر کے تندور سے نکلتا دھواں اور چنگاریاں دیوار کے اوپر سے پھلجھڑیوں کی طرح پھوٹتی نظر آ رہی تھیں۔ پیڑے بنانے کی پھٹا پھٹ، اور باتوں کی مدھم آوازیں۔ باہر گلی میں قدموں کی چاپ اور آدمیوں کی آوازیں تھیں۔ ٹیوب ویل کے تازہ پانی سے نہا کر اب یہ سارے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان کے گھروں میں عورتوں نے سوندھی سوندھی سنہری سنہری روٹیاں پکا رکھی ہوں گی۔ جنہیں کھا کر انہیں دن بھر کی صعوبت کے بعد ایک سکھ کا احساس ہو گا۔"(۵۴)

ماحول میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات کا احساس رکھنے والی نیچر کی حامل آمنہ مفتی ماحول میں ہونے والی معمولی سی تبدیلی کو بھی بے حد محسوس کرتی ہیں اور ان کا ذکر اپنے ناولوں میں بھی کرتی ہیں کہ کیسے انسان نے بذات خود اپنے ماحول کو بگاڑنے کا ذمہ اٹھار کھا ہے اور اس بگاڑ کے نتیجے میں فطرت کا نظام متاثر ہوا ہے۔ جس کا اثر انسانوں پر بھی ہو رہا ہے اور ہمارے آس پاس موجود درخت، پھول، پودوں، ندی، نالوں پر بھی ہو رہا ہے جس کا ذکر کچھ ایسے کیا گیا ہے:

"خواب جو ایک ویرانہ تھا، سرمئی رنگ کا لق دق ویرانہ جہاں دھند تھی، بے برگ و بار پیڑ تھے سفید رنگ کے، آسمان کی طرف اٹھے ہوئے اور نہر کا بے حد چوڑا پاٹ اور ان سب چیزوں کے اوپر سر طارق کا چہرہ سپر امپوز ہو رہا تھا۔ الوہی روشنی میں چمکتا ہوا چاند جیسا پر سکون چہرہ اور دو کٹے ہوئے پاؤں جو کنکروں سے بھرے راستے پر خود ہی دوڑے جا رہے تھے۔"(۵۵)

آمنہ مفتی کو فطرت سے بے حد لگاؤ ہے وہ بادل، برکھا کا انسان اور اس کے جذبات کے ساتھ کیسا تعلق ہے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"اگست کے آسمان پہ بادل گھرے کھڑے تھے۔ ترشح ابھی رکا تھا، مگر حبس کڑا تھا۔ برکھا ہونی تھی اور جم کے ہونی تھی۔ راحیلہ کو لگا کہ زمین آسمان ایک بڑا سا بلبلہ ہے اور اس بلبلے میں وہ قید ہے اور اڑتی پھر رہی ہے اس بلبلے کے ساتھ ایک بے وزن بے حقیقت وجود"(۵۶)

چڑیا کو آبادی کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ پرندوں کی بھی اقسام ہیں کچھ تو ویرانوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ جبکہ چڑیا ایسا پرندہ ہے جو آبادی والی جگہ ہی اپنا گھروندہ یعنی گھونسلا بناتی ہے اور اس میں خود کو محفوظ سمجھتی ہیں۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی آمنہ مفتی ایسے ماحول کی طرف اشارہ کرتی ہیں جہاں حالات خراب ہیں خانہ جنگی کی کیفیت ہے۔ لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ ماحول پر اس کے بے حد بھیانک اثرات مرتب ہو رہے ہیں لیکن انسان جانتے بوجھتے ہوئے خود کو فطرت سے نابلد قرار دیتے ہوئے ذرا سے مفاد کے لیے فطرت کی خوب صورتی اور حسن و شادابی کو تہس نہس کرنے پہ تلا ہے۔ اس بارے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"بے شمار چڑیاں تھیں جنھوں نے آتی بہار میں گھونسلے بنائے۔ جنگ کو کئی مہینے ہو گئے تھے مگر چڑیاں روزانہ صبح دم اسی طرح جاگتیں، چوں چوں کرتیں، کیمپ کے روشن دانوں اور کھڑکیوں میں گھونسلے بناتیں۔ انہیں علم تھا جنگیں جاری رہیں گی، انسان مرتا اور مارتا رہے گا۔ مگر انہیں رکنا نہیں ٹھہرنا نہیں انتظار نہیں کرنا کہ کون جیتے گا کون ہارے گا۔ جو بھی جیتے گا وہ وہی سب کچھ کرے گا جو پچھلے فاتحین نے کیا اور پھر ایک روز وہ ایک اور نئی قوت سے شکست کھا جائے گا۔ تو پھر واویلا کیسا؟ ہائے ہو کیا؟"(۵۷)

یہاں پر آمنہ مفتی ہمارے ہمسایہ ملک میں جاری جنگ اور اس کے نتائج جو نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ ہمارے ماحول کے لیے بھی مضر ہیں۔ ان کو ناول کے ایک کردار راحیلہ جس کی زندگی میں کئی اور مسائل جس میں سے اکثر خود ساختہ قسم کے ہیں کے ذریعے منظر نامے پر پیش کرتے ہوئے دکھاتی ہیں۔ اور ان مسائل کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

"اور اگر ہم پہ بھی جنگ مسلط کر دی جائے، ہمارے بچے باپوں کے سایوں سے محروم ہو جائیں" راحیلہ کے دماغ میں ایک عجیب سی سوچ ابھری، اس نے گھبرا کے سڑک کی طرف دیکھا، سکون تمول، آسائش، کوئنز روڈ پہ زندگی اپنے معمول پہ چل رہی تھی۔ ایف۔ آئی۔ اے کی بلڈنگ گنگارام ہسپتال، اسمبلی کی عمارات، چیرنگ کراس جہاں سے ملکہ کا بھیانک سیاہ فام بت اٹھوا دیا گیا تھا اور اب قرآن کی عمل داری تھی۔ سنا ہے یہ لاہور تیرہ بار اجڑا ہے انسان بہت ڈھیٹ ہے۔"(۵۸)

انسان کے اپنے ماحول سے روابط جیسے بھی رہے ہوں۔ وہ خود ہی اپنے ماحول کا قاتل بھی ہے مگر اپنے ماحول میں پائی جانے والی ہر ہر چیز کی خوب صورتی کو بہت ہی اعلیٰ انداز میں سراہتا بھی ہے اور دوسرے کے سامنے پیش بھی کرتا ہے۔ ایسے ہی خوب صورت ماحول کے منظر نامے کو آمنہ مفتی اپنے ناول "آخری زمانہ" میں قلم بند کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"سامنے کھڑکی پہ باریک تیلیوں والی چق پڑی تھی۔ بانس کی کرسیاں، دیوار پر سرکنڈے کے سجاوٹی گلدان میں سے منی پلانٹ کی ننھی سی شیشے کی بوتل جھانک رہی تھی۔ دو پتے اور ایک نئی نئی کونپل سرکنڈے کے گودے سے بنے چھلوں پہ بڑی نزاکت سے ٹکے ہوئے تھے۔"(۵۹)

انسان اپنے ماحول سے جڑا ہے۔ اور ماحول کی خوب صورتی اور رنگا رنگی کو بیان کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

> "چھوٹے سے لان میں ترچھی اینٹیں لگا کر کیاریوں اور گھاس کے قطعے کی حد بندی کی گئی تھی۔ دیسی گلاب کے دس بارہ پودے بھی تھے۔ موسمی پھولوں کے پودے، موتیوں کی جھاڑی اور چائے کے لیے لگائی گئی لکڑی کی میز پہ چائے کے ساتھ ایک پیزا، کچھ بسکٹ اور پیسٹریاں بھی رکھی تھیں۔(۶۰)

آمنہ مفتی کا تعلق ایسے ماحول سے ہے جو فطرت سے قریب تر تھا۔ اس وقت ہمارے ماحول کو کوئی بھی گمبھیر قسم کا مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ اول دور کے انسان معصوم اور بے ضرر تھا۔ وہ ماحول دوست تھا۔ وہ قدرت کے عطا کردہ شاہکار اور فطری ماحول میں خوش تھے۔ ایسے ہی "آخری زمانہ" کے کردار خالد جو فطرت کے بے حد قریب زندگی گزار چکا تھا جب افغانستان میں خانہ جنگی کیفیات کا آغاز ہوا تو اس کا وہاں بھی جانا ہوا۔ وہاں اس پر جو حالات کا اثر پڑا اس کو سوتے میں بھی سوچ کر وہ اکثر ہڑبڑا کے اٹھ جاتے تھے۔ مگر پھر اپنے ارد گرد کے حالات سے مانوس ہو کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

> "ہلکی ہلکی ترل ترل، جیسے ننھے ننھے پہاڑی سنگریزوں سے ٹکراتا کسی قدیم گلیشیر سے رستا پانی چپکے چپکے اپنی زبان میں سرگوشیاں کرتا ڈھلانوں سے پھسلتا نیچے بڑی ندیوں کی طرف جا رہا ہو۔ وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھا۔ اس کے چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ منڈی کا کاروبار اپنے عروج پہ تھا۔ گدھا گاڑیاں ڈھچر ڈھوں، ڈھچر ڈھوں کرتی آ جا رہی تھیں۔ کریلوں، کھیروں، تروں اور ونگوں کی خوشبو نالی کی سرانڈ کے ساتھ مل کے فضا پہ چھائی ہوئی تھی۔"(۶۱)

انسان زندگی کو بہت آسانی کے ساتھ گزارنے کا خواہاں ہے۔ فطری طور پر دیکھیں تو انسان امن پسند مخلوق ہے۔ مگر اپنے ہاتھوں ہی اپنے امن کا دشمن بھی بن جاتا ہے۔ انسانی خواہشات اور نت نئی ہونے والی ایجادات نے جہاں زندگی میں کئی آسانیاں پیدا کیں وہیں پر مسائل کا بھی انبار لگا دیا۔ جن سہولیات کے حصول کے لیے اس نے دیہات کو خیر آباد کہا شہروں میں آ کر اس سے دگنے مسائل اپنا منہ کھولے اس کے انتظار میں

کھڑے ملے۔ ایسے ہی مسائل سے دو چار راحیلہ کا خاندان جب دہلوی صاحب کے ہاں رکا تو صورت حال کیا ہوئی اس کا ذکر آمنہ مفتی کچھ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور یہاں وہاں دو ایک میلے گاؤ تکیے لڑھکے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا یہیں پلاسٹک کا دستر خوان لگا کر کھلا دیا گیا تھا اور یقیناً رات بھی اس دری پر بسر کرنا تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک قطار سے چار کرسیاں بچھی تھیں اور بس۔"(۶۲)

آمنہ مفتی اپنے ناولوں میں اکثر مقامات پر جس ماحول کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ ایک خواب اور خیال کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور ایسے ہی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"آسمان پہ کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی اچانک ہی بارش شروع ہو جاتی۔ باہر سڑک پہ دورویہ لگے جامن کے درختوں سے ٹپ ٹپ جامن ٹپک رہے تھے۔ لونڈے لپاڑے سائیکلوں پہ اودھم مچاتے پھر رہے تھے مگر گھر میں سناٹا تھا، پر ہول سناٹا۔"(۶۳)

انسان نے قدرت کے بنائے گئے نظام میں جب سے دخل اندازی کرنا شروع کی اور مشین کی ایجاد کے بعد آئے دن بننے والے نئے نئے ایٹمی ہتھیاروں اور ایک دوسرے کو نیچا دیکھانے اور خود کو دوسرے سے زیادہ طاقت ور سمجھنے کے چکر میں انسان نے خود کے ماحول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور ان ایٹمی دھماکوں سے ہونے والے جانی و مالی نقصان کے ساتھ چرند پرند کا ماحول بھی کثیف ہو کر رہ گیا ہے۔ اس منظر کی عکس بندی کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"رات کے کسی پہر بارش ہوئی تھی۔ کوہستانی راستہ گھر لوٹتے ہوئے سپاہی کو بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ پچھلے برسوں میں کتنی موتیں دیکھیں تھیں۔ کتنے انسان لمحہ بھر پہلے آنکھوں میں نفرت بھرے، جان لینے والے کی سی ہیبت سے آگے بڑھتے تھے اور اگلے لمحے مٹی کی دیواروں کے پرخچے اور جسموں کے چیتھڑے، کتے بلیوں کے سوائے کچھ نہیں بچتا تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے چلے آتے تھے یہ؟"(۶۴)

آمنہ مفتی کے ناول میں صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے جو بھی الفاظ رقمطراز کرتی ہیں ان کے گرد و پیش کے ماحول میں ہونے والے حالات پر مبنی ہیں۔ افغانستان میں جاری جنگ اور اس میں استعمال ہونے والے خطرناک آلات اور بم دھماکے نہ صرف ان کے لیے اور انسانی جانوں کے ضیاع کا موجب بن رہے ہیں۔ بلکہ ان حالات سے انسانوں کے ساتھ جانوروں، پرندوں کو بھی اس کثافت زدہ ماحول میں سانس لینا پڑ رہا ہے جو ان کی زندگی کے لیے خطرناک ہے کیونکہ اس میں زہر گھل چکا ہے۔ اس پس منظر کی عکاسی وہ ایسے کرتی ہیں:

"جنگیں بہت ہولناک ہوتیں ہیں، چاہے کرایے کے سپاہی لڑیں، چاہے شہادت کے شوقین لڑیں۔ ایک جگہ پہ آ کے سب بے معنی ہو جاتا ہے ایک دن زندہ رہنا، ایک بسکٹ، چنوں کی ایک مٹھی، پانی کا ایک گھونٹ، کلاشنکوف کا آخری راؤنڈ، بڑے بڑے نظریے ٹوٹ کر ان حقیر چیزوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ فن تعمیر کے نمونے، حسین بیل بوٹوں والے محلات، ذہن انسانی کے کرشمے، سب ڈھالیں بن جاتیں ہیں۔ خوب صورت مجسمے جنہیں ڈھالنے میں سنگ تراش عمریں بتا دیتے ہیں، اڑا دیے جاتے ہیں کہ ان کے پیچھے چھپ کے دشمن ہمیں نشانہ نہ بنا لے۔"(۶۵)

کھیت کھلیان ہوں یا جنگلات یہ قدرتی وسائل ماحولیات کا ایک لازمی جز ہیں۔ یہ نہ صرف خوب صورتی، رعنائی اور دل کشی کا باعث بنتے ہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کا بھی ایک اہم عنصر ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جیسے انسانوں کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے زمین لازمی چاہیئے ہوتی ہے ایسے ہی پرندوں کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے پیڑ پودے، درخت، جنگلات کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ہوس اور بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر درختوں کا صفایا بے دریغ کیا جا رہا ہے۔ اس لیے جنگلات میں رہنے والے جانداروں کا فطری ماحول اور ان کے مسکن تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس وجہ سے ہی کئی پرندے کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے ہی حالات کا بیانیہ آمنہ مفتی کے ناول "آخری زمانہ" میں کچھ یوں درج ہے:

"سامنے تاحد نظر گندم کے کھیت رنگ بدل چکے تھے۔گیہواں رنگت کی ادھ کچی بالیں ہوا میں جھوم رہی تھیں۔دانے ابھی دودھیا تھے۔کہیں کہیں کوئی آدمی کندھے پہ کسی رکھے ڈکا کھولنے بند کرنے جارہا تھا۔برآمدے میں کبوتر غٹر غوں،غٹر غوں کرتے پھر رہے تھے اور گلہریاں چر چراتی ہوئی کوٹھے کی منڈیروں پہ دوڑی پھر رہی تھیں۔فاختائیں اب اتنی نہیں رہی تھیں۔ہاں کوئے بافراط تھے ہابیل قابیل کے زمانے کے حیلہ ساز کوے۔"(۶۶)

آمنہ مفتی نے اپنے دونوں ناولوں "جرات رندانہ" اور "آخری زمانہ" میں ماحولیاتی عناصر کی مختلف صورتوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خوب صورتی کو بھی بیان کیا مگر اس دل کشی کی تصویر کشی کرتے ہوئے ہمارے وہ عوامل جو ہمارے ماحول کے ان عناصر کے لیے ضرر رساں ہیں اور جن کی وجہ سے آج ہم اپنے ماحول کی رعنائیوں سے محروم ہوتے جارہے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کیسے ہم خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے قدرت کے عطا کردہ ماحول کو تہس نہس کر کے خود اپنے ہی دشمن بنتے جارہے ہیں اور زمین کو خود ہی اپنے ہاتھوں دوست سے دشمن بناتے جارہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آمنہ مفتی کا پہلا ناول، جرات رندانہ، اور روایات کی جڑیں

https://www.aikrozan.com.pk/amina.mufti.first.novel.reviews.khalid.

fateh.muhammed،۲۹جون۲۰۲۰ء

۲۔ آمنہ مفتی، "جرات رندانہ"، الفیصل پبلیشر، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص۵

۳۔ آمنہ مفتی، "جرات رندانہ"، الفیصل پبلیشر، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص۶

۴۔ ایضاً، ص۸

۵۔ ایضاً، ص۱۶

۶۔ ایضاً، ص۱۸

۷۔ ایضاً، ص۱۸۔۱۹

۸۔ ایضاً، ص۲۹

۹۔ ایضاً، ص۳۰

۱۰۔ ایضاً، ص۳۳

۱۱۔ ایضاً، ص۳۳

۱۲۔ ایضاً، ص۴۳

۱۳۔ ایضاً، ص۶۴

۱۴۔ ایضاً، ص۷۱

۱۵۔ ایضاً، ص۷۱

۱۶۔ ایضاً، ص۷۵۔۷۶

۱۷۔ ایضاً، ص۷۶

۱۸۔ ایضاً، ص۸۹

۱۹۔ ایضاً، ص۸۹

۲۰۔ ایضاً، ص۸۹

۲۲۔ ایضاً، ص۹۳

۲۲۔ ایضاً، ص۱۰۲

۲۳۔ ایضاً، ص۱۳۲

۲۴۔ ایضاً، ص۱۴۵

۲۵۔ زاہد حسن، "آخری زمانہ" اور میرا ناول فوبیا (گوشہ ادب)

https://www.humsub.com.pk/20 April 2016

۲۶۔ زاہد حسن، "آخری زمانہ" اور میرا ناول فوبیا (گوشہ ادب)

https://www.humsub.com.pk/12841/zahid.hasan.15/

۲۷۔ زاہد حسن، "آخری زمانہ" اور میرا ناول فوبیا (گوشہ ادب)

https://www.humsub.com.pk/12841/zahid.hasan.15/، ۲۰ اپریل ۲۰۱۶ء

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ آمنہ مفتی، "آخری زمانہ"، الفیصل پبلیشر، لاہور، پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص۵

۳۱۔ آمنہ مفتی، "آخری زمانہ"، الفیصل پبلیشر، لاہور، پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص۶

۳۲۔ ایضاً، ص۸

۳۳۔ ایضاً، ص۹

۳۴۔ ایضاً، ص۱۱۔۱۲

۳۵۔ ایضاً، ص۱۲

۳۶۔ ایضاً، ص۱٦

۳۷۔ ایضاً، ص۱٦

۳۸۔ ایضاً، ص۲۲

۳۹۔ ایضاً، ص۲۳

۴۰۔ ایضاً، ص۴۳۔۴۴

۴۱۔ ایضاً، ص۹۲

۴۲۔ ایضاً، ص۱۰۱

۴۳۔ ایضاً، ص۱۰۱

۴۴۔ ایضاً، ص۱۲۹

۴۵۔ ایضاً، ص۱۴۸

۴۶۔ ایضاً، ص۱۵٦

۴۷۔ ایضاً، ص۱۵۸

۴۸۔ ایضاً، ص۱٦۹

۴۹۔ ایضاً، ص۱۸۱

۵۰۔ ایضاً، ص۱۸۱۔۱۸۲

۵۱۔ ایضاً، ص۱۸۷

۵۲۔ ایضاً، ص۲۱۹

۵۳۔ ایضاً، ص۲۵۹

۵۴۔ ایضاً، ص۲٦۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۹۰

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۳۷

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۶۷

۵۹۔ ایضاً، ص ۳۷۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۳۷۵

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۹۹

۶۲۔ ایضاً، ص ۴۸۴

۶۳۔ ایضاً، ص ۴۸۹

۶۴۔ ایضاً، ص ۵۱۵

۶۵۔ ایضاً، ص ۵۴۹

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۵۴

باب سوم:

"پانی مر رہا ہے" کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ

الف۔ "پانی مر رہا ہے" کا تعارف:

"پانی مر رہاہے" آمنہ مفتی کا تیسرا ناول ہے۔جو سال 2018 میں منظر عام پر آیا۔آمنہ مفتی کا یہ تیسرا ناول بھی گزشتہ دوناولوں کی طرح الفیصل ناشران لاہور پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ناول کے 42ابواب ہیں جبکہ ناول "پانی مر رہاہے" کے صفحات کی تعداد188 ہے۔

ناول کی کہانی کی بات کی جائے تو ناول کا آغاز اسرار باؤ کی شہر سے واپسی سے ہوتا ہے۔اس کے چھے سوتیلے بھائی بھی موجود ہیں اور اس کو شہر وکیل بننے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر جب وہ واپس آیا تو اس کا حلیہ بہت ہی عجیب و غریب قسم کا ہوتا ہے۔اس سے قبل کہ اس سے سب کی پوچھ گچھ ہو اس کو سانپ ڈس لیتا ہے اور اس کی حالت غیر ہوتی دیکھ کر اس کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے مگر ہسپتال اور ڈاکٹر کی مایوس کن حالت کے پیش نظر اس کا بڑا بھائی مینا اس کو بھوریوں میں جوگی کی کٹیا میں لے جاتا ہے۔

اس کے فوری بعد ناول کو فلیش بیک میں لے جایا جاتا ہے اور یہاں ایسے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔میاں اللہ یار اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ بھوریوں کی زمین کو کاشت کرنے کے چکر میں جب بھوریوں میں جاتا ہے تو وہاں ایک سور اس پر حملہ کر دیتا ہے ایسے میں ایک جوگی اس کو اپنی کٹیا میں لے جا کر علاج کرتا ہے۔جس سے وہ بھلا چنگا ہو جاتا ہے مگر جوگی میاں اللہ یار کی شناخت کو جھٹلا دیتا ہے۔ادھر فضل بی بی جو کہ اسرار کی ماں ہے پر اسرار طور پر سانپ کے کاٹنے سے مر جاتی ہے تو اسرار کے لیے بیتل بکری دو میمنے سمیت لائی جاتی ہے مگر جلد ہی مینے کی بیوی شاماں کی دیکھ بھال کی وجہ سے اس بکری کو بھوریوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں اس کے میمنے آدم خور بن جاتے ہیں اور یہ منظر مینا دیکھ لیتا ہے مگر میاں اللہ یار اس کو نہیں مانتا ہے اور اس کے بعد آنے والے زلزلے میں بکری میمنے اور گاؤں سے غائب ہونے والے افراد زمین کے پھٹنے سے اس میں سماجاتے ہیں اور میاں اللہ یار بھی زمین پر مکئی کے دانوں کی طرح پھڑکتا ہے۔

کہانی کے دوسری طرف شہر میں خوب رو عرفان صاحب ان کی بیوی شاہدہ جو بے حد خوب صورت ہیں مگر بانجھ ہیں ان کے ہمسائے میں بتراخاندان جن کے ہاں دادی کو چھوڑ کے سب مسلمان ہیں۔عرفان اور مدھو کے بیچ کچھ تعلق ہے۔عرفان صاحب دریاؤں کو لے کر پریشان ہیں وہ گھر پر جانور بھی پالنے لگتے ہیں ان کے گھر میں مچھلیوں کی بارش ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد کئی لوگوں کے گھروں میں آدھے انسانی دھڑ اور

آدھے مچھلی کے دھڑ والے بچے پیدا ہوتے ہیں شاہدہ مر جاتی ہے۔بتر اہاؤس سے بھی سب آہستہ آہستہ سب غائب ہو جاتے ہیں۔ادھر عرفان صاحب بھی غائب ہو جاتے ہیں اور یہ سب لوگ بھوریوں میں آکر بس جاتے ہیں۔

دوسری طرف اسرار کی یونی ورسٹی کی خوب صورت لڑکی اس پر عاشق ہو جاتی اور یہ بھی اس پر فدا ہو جاتا ہے اور نازنین کا گھر بھی بترا اور عرفان صاحب کے ہمسائے میں ہے اور ان کے گھروں میں اگے ہوئے جنگل میں ایک دن دونوں جاتے ہیں واپسی پر نازنین بیمار ہو جاتی ہے اوراسرار کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر کے لندن چلی جاتی ہے اور وہاں جل پری کو جنم دیتی ہے اور طلاق لے کر واپس آجاتی ہے اور عرفان وغیرہ کے ساتھ کٹیا میں رہتی ہے اس کے بعد وہاں ایک زلزلہ آتا ہے اور سب اس میں فنا ہو جاتے ہیں مگر نازنین اور اسرار باؤ بچ جاتے ہیں۔اس کے بعد یہ دونوں شہر آجاتے ہیں جہاں دیوار کی سیلن کو دیکھ کر نازنین کی ماں کہتی ہیں پانی مر رہا ہے۔اس کے بعد دونوں مالدیپ میں ایک شادی میں جاتے ہیں وہاں ان کے ساتھ کچھ واقعات ہوتے ہیں اور یہ وہیں کے ہو جاتے ہیں اور ان کی نسل وہاں پروان چڑھتی ہے۔

ناول "پانی مر رہا ہے" پر ہمارے علماء و دانشوروں نے جو تبصرے کیے ہیں۔ان میں سے چند ذیل میں دیئے جارہے ہیں۔بقول محمد حنیف "مرتے دریاؤں کا عکس اور قیامت کی نشانیاں لئے ہے اور زہر اور شہد کے ذائقے سے مملو یہ ناول،ماحول،انسانوں اور چرند پرند کو ایک نئے زاوئے سے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔"[1] غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

> "پانی مر رہا ہے میں کرداروں کے ظاہر بھی بدلتے ہیں اور باطن بھی۔انسان صرف ابنارمل ہی نہیں ہوتے،میو ٹیٹس بن جاتے ہیں اور موجود کی معلوم حقیقتوں کو بے چہرہ کر کے نا قابل شناخت بنا دیتے ہیں۔ہمارے مرتے دریاؤں کی کہانی کئی لوگوں نے لکھی ہے۔ہندو مائتھالوجی میں سرسوتی کا سطح سے معدوم ہونا،ہاکڑہ کا سوکھ جانا

تو سری روایتیں بھی ہیں اور تاریخی صداقت بھی۔ خود ہم نے ستلج، بیاس اور راوی

کے دوآبوں کو اپنے ہاتھوں دائمی پیاس کا تحفہ دیا ہے۔ "(۲)

ایسے ہی آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آمنہ مفتی نے "پانی مر رہا ہے" میں ستلج کنارے کی رہتل کو موضوع بنایا ہے۔ مگر ایک الگ ہی ڈھنگ اور انداز سے کہ معمول کی زندگی ایک الگ ہی ڈھنگ پر چلنے لگتی ہے اور وقت کی طنابیں اکھڑ کر عدم کی تاریکی میں جا گڑتی ہیں۔ "(۳)

"پانی مر رہا ہے" کے بارے میں غلام حسین لکھتے ہیں:

"پانی مر رہا ہے دو انتہاؤں کے ایک دوسرے سے الگ ہونے اور ایک دوسرے میں دھنس جانے کی کہانی ہے۔ ایک طرف دیہات کی ان گھڑ اور اپنی کرختگی پہ اصرار کرتی حیات ہے تو دوسری طرف شائستگی، اجلاہٹ اور موزارٹ کی پر کیف سمفنی میں ڈھلی، نرم اور خوش ادا زندگی اور ان دونوں کے مابین ہے، بھوریوں والی اسرار عجوبے اور حیرت سے بھری زمین جو دونوں انتہاؤں کو نگل جانے پر قادر ہے اور ہر نوع کے خلاف واقعہ واردات کی پناہ گاہ۔ جس کی پیاس مذکورہ تہذیبی انتہاؤں کے لہو سے بجھتی ہے اور جس کا پانی بالاخر ان دونوں کی معدومیت کا باعث بنتا ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ پانی دونوں کی بنیادوں میں بھرتا ہے اور دیواروں سے رستا ہے۔ "(۴)

اقبال خورشید اپنے کالم میں آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ کہ:

"رواں برس ہی آمنہ مفتی کا ناول "پانی مر رہا ہے" پڑھنے کا خوش گوار تجربہ ہوا۔ ناول نگار کی دلیری قابل تعریف، جس نے کہانی میں ناممکنات کو اتنی پختگی اور خوب صورتی سے شامل کیا کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھے۔ اس کے عجیب الخلقت کردار کہانی سے

باندھ کر آپ کو کلائمکس تک لے جاتے ہیں۔کلائمکس، جسے شاید آپ فوری نہ بھلا سکیں۔[5]

ب۔"پانی مر رہا ہے"میں ماحولیاتی عناصر کا تجزیہ:

آمنہ مفتی کا شمار لکھنے والے ان چند افراد میں ہوتا ہے جن کو اپنی صلاحیتوں کا ادراک بھی ہے اور ان کو استعمال کرنے کا سلیقہ بھی ان کے اندر موجود ہے۔وہ اپنے ناولوں میں موجود کہانی، کرداروں، منظروں اور ان مناظر میں پائی جانے والی کیفیات کو اپنے شعور کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔مگر اس کے باوجود بھی اکثر قاری کے ذہن و دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ آمنہ مفتی کو اپنے ناولوں میں قیامتوں کو برپا کرنے کا شوق کیوں ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو وہ تو حالات و واقعات اور انسان کے کیے گئے اعمال و افعال کو ہی بیان کرتیں ہیں۔انسان اور اس کے ماحول کے ساتھ موجود رشتے اور ان کے تخیل میں موجود ماحول اور اس کی خوب صورتی و دل کشی کو ہی پیش کرتی نظر آتیں ہیں۔جیسا کہ آمنہ مفتی نے اپنے گزشتہ دو ناولوں میں بھی ماحولیاتی عناصر کا استعمال کیا ہے اور ان کے تیسرے ناول "پانی مر رہا ہے"میں بھی ماحولیاتی عناصر کا استعمال کیا گیا ہے۔آمنہ مفتی کے تیسرے ناول میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے مرنے کی داستان اور اس کی وجوہات کا تذکرہ اور اس سب میں انسان کی ہوس اور اس کے لالچ سے ہونے والے نقصان کا بیان بھی ہے کہ کیسے انسان نے ذرا سے فائدے کے لیے اپنے خود کا ہی بہت بڑا ضیاع کر لیا ہے۔انسان کے اسی لالچ نے اس کے ماحول پر بے حد گہرے اثرات ڈالے ہیں اور ایسے ہی حالات پہ مشتمل آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے"کی شروعات ہوتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

> "بھوریوں والی زمین سے جنگلی بلا باہر نکلا، اگلے پنجے ویران بھبھل میں گاڑے، کمر کو کمان کیا، زبان باہر نکال کے لمبی سی جمائی لی۔سڑک دور دور تک خالی تھی۔آسمان پہ مٹی کی یہ موٹی بھوری تہہ جمی ہوئی تھی اور کھیتوں میں دھان کی اگیتی پنیری اگ رہی تھی۔اس بار ایسی گرمی پڑی تھی کہ انسان، جانور، چرندے، پرندے سب زبانیں

نکالے ہانپ رہے تھے۔دھوپ نکلتی تھی تو اتنی بے حیا کہ ابھی صبح ہی ہوتی تھی مگر دھوپ کا جوبن،ٹھار دوپہر کو مات کرتا تھا۔(۶)

آمنہ مفتی کے ناول میں ہمیں ایساماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔جیسے وہ اپنے آس پاس سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے بعد لکھا گیا ہو۔وہ ماحول جس میں آج کا جان دار اپنی زندگی تو گزار رہا ہے مگر اس کے ارد گرد کا ماحول اس قدر آلودہ ہو چکا ہے کہ وہ اس کے اعصاب پہ بہت گہرا اثر چھوڑ رہا ہے کیونکہ جب ہمارے گردوپیش کا ماحول ہی صاف ستھرا نہیں ہو گا تو وہ ہمارے جان داروں کی زندگیوں پہ ایک خطرے کی لٹکتی تلوار کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا اور اس کا اثر ان کے رہن سہن،خوراک،افزائش نسل ہر ہر مدار پہ پڑتا ہے۔ایسے ہی منظر کو بیان کرتے ہوئے آمنہ مفتی رقم طراز ہیں:

"بلا تھوڑی دیر بے مقصد ہی سڑک پہ کھڑا رہا۔یوں بھی اس کی زندگی کا مقصد گندی پلی،بدذائقہ چھچھوندریں،چوہے اور لالا ئینیں کھا کے کسی سایے میں اونگھنے کے سوا تھا ہی کیا؟بہت تیر مارتا تو کسی اپنے جیسی جھبری،نوکیلے کانوں والی بلی پہ عاشق ہو جاتا اور مرنے سے پہلے ایک جھول چتکبرے بچوں کا اپنے پیچھے چھوڑ جاتا جو اس فانی دنیا میں اس کے ہونے کا تسلسل برقرار رکھتے۔"(۷)

آمنہ مفتی اپنے ناول"پانی مر رہا ہے"میں دیہات میں چاول کی فصل کو اگانے کے منظر اور اس ماحول میں پائے جانے والے چرند،پرند ان کی خوراک کے بارے میں منظر کشی کر رہی ہیں اس کے ساتھ ہی اس پر سکون ماحول میں ہونے والی ذرا سی ہلچل اور اس کے نتیجے میں موجود جان داروں کے رد عمل کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتیں ہیں:

"سڑک ویران تھی کیونکہ اس طرف والے سب کلوں میں پنیری لگ چکی تھی۔نہری پانی کے کھالوں کے کنارے،تیتر اور بگلے اپنی لمبی لمبی ٹانگیں جھلاتے پھر رہے تھے،جن میں بہتی ننھی منی مچھلیاں من وسلویٰ کی صورت ان کا بھوجن بننے کو چلی آئی ہیں۔بلے نے اپنی نندرائی ہوئی آنکھوں سے دور سڑک پہ اڑتے غبار کو دیکھا اور کسی نا

معلوم ارتعاش نے ایک لحظے کے لیے اسے ایسے جھنجھوڑا کہ وہ گھریلو بلی کی طرح، خیں،
کر کے پشم کی بھاری گیند کی صورت پھول گیا اور زقند بھر کے بھوریوں پہ اگی کوڑ تومبے
کی بیلوں اور اکانہہ کی جھاڑیوں کے پیچھے اپنی کمین گاہ میں جاچھپا۔"(۸)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں جس ماحول کا ذکر کر رہی ہیں۔ وہ ماحول یقینی طور پہ اب صرف ایک خواب کی سی کیفیات ہی ہو سکتی ہیں کیونکہ اس جیسا ماحول اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ آج کا ہمارا ماحول اور اس کی فضا اس قسم کے منظر کے لیے سازگار ہی نہیں رہی ہے۔ فطرت میں پائے جانے والے اس جیسے مناظر اب نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ ایسے ہی منظر پہ روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"روشن دانوں میں چڑیلیں اور ابابیلیں رہتی تھیں اور مکان کی بنیادوں میں گھونسیں اور
کالے ناگ رہتے تھے، جو چاندنی راتوں میں سڑک کی بھبھل میں لوٹ لوٹ کر، ناگن
اور نگینہ، کا رقص کرتے تھے۔ مکان کے پچھلے صحن میں شہتوتوں کے پیڑ تھے اور ٹاہلی
کے اونچے درخت، جن پر لگی زرد پھلیاں، گرم خشک ہوا میں چھن چھن بولا کرتی
تھیں۔"(۹)

ہماری فضا، زمین حتیٰ کہ سارے کا سارا ماحول ہی انسان کے تابع ہے انسانوں کا رہن سہن، تہذیب و معاشرت ہر چیز ماحول پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور صرف ماحول ہی نہیں انسان بھی آس پاس کی اشیاء سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" میں جنت بی بی جو کہ میاں اللہ یار کی پہلی بیوی تھی مگر پہ در پہ ہونے والے حالات و واقعات نے اس کی زبان پہ چپ کے تالے لگا دیئے تھے۔ وہ گرد و پیش میں ہونے والے ہر واقعہ پہ نظر تو رکھتی تھی۔ مگر اس کا کردار ایسا ہو چکا تھا کہ نہ تین میں نہ تیرا میں۔ "جنت بی بی" کے اسی کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آمنہ مفتی کہتی ہیں:

"جنت بی بی کے آبنوسی چہرے پہ ہمیشہ کی طرح کوئی تاثر نہ تھا۔ ناک کے دونوں نتھنوں
کے درمیان گھنگھروؤں والی بالی، اونٹ کی نکیل کی طرح لٹکی ہوئی تھی اور موٹے
موٹے ہونٹوں پہ چپ کا وہی ناگ کنڈل مارے پڑا تھا جو سالوں سے وہاں براجمان تھا۔
مکان کی بنیادوں میں رہنے والے کوڑیالے سانپوں کی طرح۔ نہ تو وہ سوتن کے آنے پہ

روئی اور نہ اس کے مرنے پہ ہنسی۔ اسرار کے کاندھوں پر میڈوسا کا کاسئہ سر اس نے
بھی دیکھا تھا بلکہ بڑھ کر ان قاتل لٹوں کو بوسہ بھی دیا تھا۔ اس کے سخت کافر کرتے
کے باوجود گلے بھی لگایا تھا۔ مگر اس کے چہرے پہ کسی تاثر کی کوئی تتلی، بھنبھیری کہیں
اڑتی
نظر نہیں آرہی تھی۔"(۱۰)

آمنہ مفتی اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں باؤ اسرار کی گاؤں آمد اور پھر اس کے بعد کے واقعات کے بیان کے ساتھ مینے کی بیوی شاماں جس نے باؤ اسرار کو پالا تھا بالکل اس کی پرورش اور دیکھ بھال اس انداز سے کی تھی جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ اس کے اور باؤ اسرار کے رشتے کے حوالے سے جو شاماں کے جذبات تھے ان کا اظہار اس انداز میں کرتی ہیں:

"شام ہونے سے پہلے مینے کی بیوی شاماں نے دیور کے لیے صاف ستھرا واش این وئیر کا
جوڑا نکالا اور میاں کی ہلا شیری پہ پردیسی دیور کے کمرے میں چلی آئی۔ شاماں، دیہات
کی عام معمولی لڑکی نہیں تھی۔ شاملات دیہہ (جسے کثرت استعمال کے باعث لوگ
شاملاٹ کہتے تھے) کے آس پاس کئی آبادیوں میں اس کے جوڑ کی زنانی پیدا نہیں ہوئی
تھی۔ شاید کسی جینٹیک میوٹیشن سے وہ ایک درمیانے درجے کے زمیندار کے گھر
پیدا ہو گئی تھی۔ گوری، اونچی، لمبی، آنکھیں جیسے آم کی پھانک اور بال جیسے ساون کی
امنڈتی گھٹائیں جو آملے کے جھنڈوں پہ جھکی کھڑی ہوں۔"(۱۱)

ناول کے اس حصے میں جب باؤ اسرار کی واپسی کے بعد اس کو سانپ نے کاٹ لیا تو اس کے بعد کے ماحول کی عکس بندی آمنہ مفتی ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"مکان میں اور احاطے کے باہر، کھیتوں سے پرے دور دور تک کہرام مچ گیا۔ کھیتوں میں
دور حد سماعت تک کوکیں گونجنے لگیں۔ ہو، ہو، ہلا، ہلا، سایوں میں سوئے ہوئے کتے
گھبرا گھبرا کے بھونکنے لگے۔ ٹیوب ویلوں پہ نہاتے مرد، آدھے ننگے، آدھے ڈھکے،
گیلے پیروں میں مٹی کچکچاتے میاں اللہ یار کے گھر کی طرف دوڑے۔ جن لوگوں کو

اسرار کی آمد کی خبر نہیں ملی تھی۔انہیں بھی علم ہو گیا کہ اسرار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔"(۱۲)

آمنہ مفتی نے اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں دریائے ستلج کے خشک ہونے کے بعد اس کی گزر گاہ پہ موجود رہتل کو موضوع بناتے ہوئے ایک الگ ہی رنگ سے اس کو پیش کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ جس میں معمول کی زندگی ایک الگ ہی انداز و اطوار سے چلتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ جب اشیاء کے تناسب میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پہ تخلیق کے عمل میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتیں ہیں۔ اس ضمن میں آمنہ مفتی یوں بحث کرتی ہیں:

"بھوریوں والے کلوں کی داستان بھی عجیب ہے۔ میاں اللہ یار کا ڈیرہ، بلکہ ایک وہ ڈیرہ ہی کیا؟ سارا پنجاب دریاؤں کا میدان ہے۔ دریاؤں کی پھینکی ہوئی ریت، ٹوبے، ٹیلے، ٹیکریاں، ڈھکیاں، ٹبے۔ ہر ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ تو یہ بھوریاں بھی دریائے بیاس کی پرانی گزر گاہ پہ، ایک دو سے ڈھائی ایکڑ چوڑا اور تقریباً اٹھارہ سے انیس کلو میٹر لمبا ریتلا ٹکڑا تھا۔ ان بھوریوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ بلندی سے دیکھنے پر یہ ریتلا سلسلہ ایک عظیم الجثہ ناگ دکھائی دیتا تھا جو کسی مستی میں لہرایا ہوا پڑا ہو۔"(۱۳)

ناول "پانی مر رہا ہے" میں آمنہ مفتی دریائے ستلج کے کنارے موجود غیر آباد ریتلی زمین اور اس میں پائی جانے والی مخلوق چرند، پرند، جنگلی جانور، حشرات الارض، پیڑ پودوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"بھوریوں والی زمین سالہا سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ اس ریتلے سانپ کا آخری سرا، سرحد کے پار ستلج سے جا ملتا تھا۔ ساری زمین خود رو کانٹے اور جھاڑیوں اور کشیدہ قامت درختوں سے پٹی پڑی تھی۔ ریت میں پناہ لینے والی مخلوق اور ان کے شکاری جانور از قسم نیولے، باگڑ بلے، سؤر، گیدڑ اور خال خال بھیڑیئے، جھاؤ چوہے وغیرہ، یہاں بکثرت پائے جاتے تھے۔"(۱۴)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں ماحول میں پائی جانے والی چھوٹی چھوٹی اشیاء جو ماحول کی خوب صورتی اور رعنائی و دل کشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں ان کو جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے اپنے ناول کا حصہ بناتے ہوئے ان کا ذکر بہت ہی اچھے انداز میں کرتی ہیں اور ایسے ہی ایک مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "ایک کے

بعد ایک ٹیلہ، چھوٹے چھوٹے پوکھر، جن میں گئی برسات کا پانی ابھی تک کھڑا تھا اور اس پانی میں خدا جانے کہاں سے عجیب و غریب مچھلیاں آجاتی تھیں اور ان کو کھانے کے لئے نیل کنٹھ اور بگلے۔"(15) میاں اللہ یار کی بھوریوں کی زمین کو آباد کرنے کی ضد اس کو اور اس کے خاندان کو لے ڈوبے گی اس کا اندازہ نہیں تھا ابھی تک اس کو اس لیے وہ بے دھڑک ہو کے بھوریوں کے کلے کو ماپنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ پے در پے ہونے والے واقعات سے بھی سبق حاصل نہیں کرتا ہے۔ یہاں آمنہ مفتی نے بہت ہی واضح انداز میں ایک بات سمجھا دی ہے کہ جب ہم قدرت کے بنائے گئے نظام میں دخل دیتے ہیں اور ماحول کو فطرت کے بجائے انسان کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ہم مختلف مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور پھر نت نئے اور محیر العقول واقعات بھی جنم لیتے ہیں۔ اس مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

"مینا لاکھ سیانا سہی لیکن آدھی رات کو بکائن کے پھولوں کی نشہ آور خوشبو کے جلو میں کی جانے والی اتنی گہری باتیں ابھی اس کی سمجھ میں آتی تھیں، سو آج بھی چپ چاپ چلتا رہا۔ ایک ذرا گہرے ٹوبے میں تو اس نے ایک ایسی مچھلی بھی دیکھی، جس کی مونچھیں تھیں اور ایک آنکھ پہ مینے کی آنکھ کی طرح سفیدی سی چڑھی ہوئی تھی اور یہ مچھلی ٹوبے کی کسی گہرائی سے لمحہ بھر کو نکلی تھی اور باہر بیٹھے نیل کنٹھ کو دیکھ کر غڑاپ سے واپس چلی گئی تھی --۔ پانی کا چھپاکا یقیناً میاں اللہ یار نے بھی سنا تھا کیونکہ تھکے ہوئے گھوڑے کی چال چلتے چلتے اس نے ایک ہنکارہ سا بھرا تھا اور تضحیک آمیز انداز میں بڑ بڑایا، "ہنہہ! ڈوڈوؤں کے بچے۔"(١٦)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں بھوریوں کے حدود اربعہ اس کے دیگر کھیتوں سے منسلک ہوتی اس کی سرحدوں اور اس سارے علاقے میں بسنے والے حیوانات، نباتات، انسان و دیگر مخلوق کی اپنی بنائی گئی دنیا اور اس کے ماحول پہ نظر ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"چلتے چلتے اب وہ ایک ایسی جگہ آپہنچے تھے جہاں بھوریاں اپنی سب سے زیادہ چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیتوں کا جو حاشیہ ابھی تک انہیں ساتھ ساتھ نظر آرہا تھا اب غائب ہو چکا تھا۔ دونوں طرف دور دور تک ریت تھی اور عجیب قسم کے نباتات۔ جو

اصل میں تھے تو وہی جو ایسی زمینوں میں ہوتے ہیں لیکن شاید بہت عرصے سے یہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا(کیوں نہیں رکھا تھا؟ یہ بات مینے کے لیے اتنی ہی محیر العقول تھی، جتنی آپ کے اور میرے لئے۔)اس لیے یہ پیڑ پودے، اپنی اقلیم میں ایستادہ قلعوں اور محلات کی طرح، پر شکوہ نظر آرہے تھے۔"(۱۷)

انسان کا لالچ، ہوس اور مزید سے مزید تر کے پالینے کی چاہ نے ہی انسان کو آج زوال کی طرف دھکیلا ہے۔ کہ ہم نے اپنے لالچ اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اپنے ماحول اور اس میں بسنے والے دیگر جان داروں کی زندگی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے اور نہ صرف خطرے میں ڈال رکھا ہے بلکہ ان سے ان کے گھر ان کی پناہ گزینوں کو چھیننے کے درپہ ہو گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں پائے جانے والے جنگلات کا صفایا کرنے والے بھی ہم ہی ہیں۔ ایسے ہی بھوریوں کی زمین پہ پائے جانے والے جنگل اور اس کی مخلوق اور ان کا اپنے ماحول سے جو رشتہ ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں:

"اکانہہ کے درخت اتنے گھنے اور ان کے تنے اتنے سیدھے تھے کہ دور سے چیڑ کے جھنڈ معلوم ہوتے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ مینے نے چیڑ کے درخت بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے ورنہ اس کے دل پہ اس قدر دہشت طاری نہ ہوتی۔ ٹاہلیوں کے درخت اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان کی چوٹیاں، کہیں بادلوں میں چھپی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا بادل بہت دور تھے اور ان میں سمٹا، پہلی تاریخوں کا چاند، دن میں بھی دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ دب کی جھاڑیاں اور ان میں کھلے دب کے وہ روپہلی پھول، جن سے لوگ پھول جھاڑویں بناتے ہیں، ون کی جھاڑیوں کے غیر مختتم سلسلے اور ریت پہ اس وقت کہیں سایوں میں ستاتے جانوروں کے پیروں کے نشان اور ان نشانوں کو کاٹتی، رینگنے والے جانوروں کے جسموں کی رگڑ سے بنی جھریاں اور لکیریں۔"(۱۸)

قدرت کی عطا کردہ خوب صورتی و شادابی آمنہ مفتی کے ناول میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ کہ کیسے فطرت نے ہمیں طرح طرح کی نعمتوں سے نواز رکھا ہے اور یہ آمنہ مفتی کی فطرت ہے کہ وہ ماحول میں ہونے والے چھوٹی سی تبدیلی کو بھی محسوس کر لیتی ہیں اور ماحول کا جائزہ بھی بہت ہی باریکی سے لیتی ہیں۔ ایسے ہی

عرفان صاحب اور دیگر جو بھوریوں کی زمین پہ اپنا مسکن بنا کے آباد تھے ان پہ ان الفاظ میں بحث کرتی دکھتی ہیں:

"جنڈ کے پستہ قامت درختوں کا ایک مختصر سا جھنڈ جو شائد دو سے تین کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس جھاڑ کو غالباً قدرت کے ہاتھ نے اس صفائی سے ایسی شکل دے دی تھی کہ اس جھنڈ کے اندر ہی اندر بیئے کے گھر کی طرح ایک خوب کشادہ انسانی رہائش گاہ بن گئی تھی۔ جس میں کمروں سے ملحقہ بیت الخلاء تو نہیں تھے البتہ ایک دوسرے کو علیحدہ کرتی ہوئی شاخوں کی دیواریں سی بن گئی تھیں اور ہر خانہ ایک الگ کمرہ تھا۔ ان کمروں کے درمیان راہداریاں، صحنچیاں اور ایک ننھا سا برساتی پانی کا تالاب بھی تھا۔ اس تالاب میں شائد بینے کا وہم تھا یا واقعی دریائی جھینگوں کا ایک جھلر، تیرتا پھر رہا تھا اور خدا جانے اروی یا سنگھاڑے کے ہرے ہرے پتوں نے تالاب کو آدھا چھپا رکھا تھا۔ جنڈ کی کسی کسی جھاڑی کے ساتھ ککروندے اور ون ایسے الجھ کر اگے تھے کہ ان کمروں، صحنچیوں اور راہداریوں میں ککروندے، ون اور لہسوڑے کے پھل قمقموں کی طرح جگہ جگہ چمک رہے تھے۔"(۱۹)

قدرتی طور پہ ایسا ہے کہ انسان کا اپنی فطرت کے ساتھ بہت ہی گہرا اور مضبوط رشتہ ہے اور اس تعلق کو بیان کرنے میں آمنہ مفتی کا قلم بہت چابک دستی سے چلتا دکھتا ہے۔ ان کے ناول میں ماحولیات کی عکاسی اس اعلیٰ انداز میں کی گئی ہے کہ انہوں نے ہماری پوری تہذیب کو اپنے ناول میں سمیٹ لیا ہے۔ لیکن انسان اپنے ماحول کے اس دائرے سے جب تجاوز کرتا ہے تو اس کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسا ہی میاں اللہ یار کے ساتھ ہوا جن کے احساسات اور جذبات کا اظہار آمنہ مفتی اس انداز میں کرتی ہیں:

"میاں اللہ یار ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے قریب ایک کنالی میں، گھاس پھونس کو آگ لگائے ایک عجیب وضع کا آدمی بیٹھا ہے۔ کالا سیاہ، بالائی جسم برہنہ اور اتنا سوکھا سڑا کہ ایک ایک پسلی با سانی گن لی جائے۔ ستر پوشی کو ایک معمولی سی چادر باندھی ہوئی تھی۔ کان میں مندری تھی جس سے بینا فوراً تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو یہ جوگی

ہے۔اس خیال کے آتے ہی،اس کے چہرے کے رونگٹے، گھبرائی ہوئی بلی کی دم کی طرح کھڑے ہوگئے اور اس کو رستے میں ٹیلے پہ ہونے والی پر اسرار نقل و حرکت کی وجہ سمجھ آگئی۔تو وہ سانپ تھے۔ سینکڑوں یا پھر ہزاروں۔"[۲۰]

آمنہ مفتی نے اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں ماحول کے انسان کے ساتھ اور انسان کا ماحول میں پائے جانے والے دیگر اجسام سے جو واسطہ ہے کو بہت ہی واضح الفاظ میں سامنے لایا ہے کہ جب ہم بگاڑ کے نتائج کو پس پشت ڈال کر خیر اور شر کی کیفیات کو بگڑنے دیتے ہیں تو اس کے اثرات کی لپیٹ میں تمام لوگ آتے ہیں اور بظاہر معمولی اور بے ضرر دکھنے والے انسان ہوں یا حیوان یا چاہے چرند پرند ہی کیوں نہ ہوں سب پہ ماحول اثر انداز ہوتا ہے اور اس میں بگاڑ پیدا کرنے والے کو سزا بھی مل جاتی ہے۔ایسے ہی منظر کی عکس بندی کچھ یوں کرتی ہیں:

"اس بانبی میں ایک ناگن بھی رہتی ہے۔جس کی عمر کئی سو سال ہے اور جب اس کا دل چاہتا ہے وہ بھیس بدل کے انسانوں کی جون میں آجاتی ہے۔اس جون میں وہ امیر کبیر لوگوں سے شادی کرتی ہے،ان کی دولت کو سمیٹتی ہے اور یہ سب لے کے واپس ناگن کی جون میں اپنی بانبی میں چلی جاتی ہے،جاتے جاتے وہ اس گھر کے ایک بندے کی جان بھی لیتی ہے۔سنا ہے کہ اسی نے میاں اللہ یار کی دوسری بیوی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے کو چھپ کے دودھ پلایا۔"[۲۱]

آمنہ مفتی نے فطرت کے قریب تر ماحول کے اندر اپنی آنکھ کھولی تھی۔وہ ماحول جس میں سادگی تھی خلوص تھا خوب صورت تھی شادابی تھی۔جس میں فطرت کی پیدا کردہ تمام مخلوق اپنے اپنے مسکن میں شاد و آباد تھی۔درخت، پیڑ، پودے جانور، انسان غرض ہر طرف فضا میں امن، سکون، اطمینان کی کیفیت پائی جاتی تھی انسان کے اندر لالچ اور سرکش انداز و اطوار نے سر نہ اٹھایا تھا اس وقت کے جذبات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

"ڈھلتی راتوں کا چاند جو دن بھر آسمان پہ کہیں ٹنگا، نظر سے پوشیدہ رہا تھا، اب بکائنوں کے اوپر چمک رہا تھا۔ہوا میں گرد اور گوبر کی بو ٹھہری ہوئی تھی اور سوائے جھینگروں کی سنسناہٹ کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مینے نے کروٹ بدلی تو اس کا پاؤں لگ کے پائینتی سے تھوڑی سی دہر ہٹ گئی۔ادوائین شاید چھوٹی پڑ رہی تھی،اس

لیے کچھ حصے میں نیا سخت بان باندھ کر پورا کیا گیا تھا۔ بان کی ننھی سی پھانس، مینے کے انگوٹھے میں چبھی اور ایک میٹھا سا درد پورے جسم میں پھیل گیا جیسے نو عمری کا عشق۔ وہ پھانس ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ شاماں اندر داخل ہوئی اس کے جلو میں لونگ اور الائچی کی خوشبو کا تیز بھپکا تھا، مینے کا پھانس نکالتا ہاتھ کانپ گیا۔"(22)

انسان کی فطرت کی اگر بات کی جائے تو فطری طور پہ وہ بہت ہی صلح جو فطرت کا مالک ہے اور اپنی زندگی کو قدرت کے عطا کردہ نظام کے مطابق سادگی سے گزارنے کا خواہاں ہے۔ ایسی ہی فطرت کے سادہ مناظر سے بھرپور فضا اور ماحول کی نشان دہی کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"کمو نائین کی انگلیوں سے آٹے کا دودھ ٹپک ٹپک کر کچے صحن میں جذب ہو رہا تھا، اور ایک ایسی ہوا چل رہی تھی جس میں گہری نیند اور بے فکری گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ آک کے پودوں کی کاسنی اور دودھیا کلیوں جیسی زہریلی نشیلی ہوا۔ میاں اللہ یار کی پلکیں آپ سے آپ مندنے لگیں اور وہ بے وقت سو گیا۔"(۲۳)

آمنہ مفتی اپنے آس پاس میں پائے جانے والے ہر چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے واقف تھیں اور ارد گرد کے ماحول میں ہونے والی ذرا سی تبدیلی بھی ان کو ذہنی طور پہ رنجیدہ کر دیتی ہے اور اپنے ناول میں وہ ہمیں ہمارے ہاتھوں ہونے والے نقصان اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والے طوفان سے بھی آگاہی دیتی ہیں۔ ایسے ہی حالات پہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ ہوا زوروں میں چل رہی تھی۔ بڑی نہر میں سرخی مائل مٹیالا پانی اپنی اندھی طاقت کے نشے میں گھاں گھاں بہہ رہا تھا۔ ذخیروں پہ باگلیں چکر کا رہی تھیں اور گیدڑ اپنی بھٹوں کے دہانوں پہ کھڑے دلدوز آوازوں میں بین کر رہے تھے۔"(۲۴)

میاں اللہ یار کی پہلی بیوی جو ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں میاں سلطان محمود کی اکلوتی صاحبزادی تھیں اور بھر بھر کے جہیز لے کر آئی تھیں اس پہ میاں اللہ یار سوت لے کر آ گیا اور صرف سوت ہی نہیں بیٹا بھی پیدا کر لیا اور اس کے بعد سے کبھی اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ فطری طور پہ یہ ایک غلط فیصلہ تھا جس کو جنت بی بی چپ چاپ سہتی جا رہی تھی مگر اچانک ہونے والے واقعے نے اس کو جھنجھوڑ

کے رکھ دیا اور اس نے میاں اللہ یار کو خوب سنائی۔ اس وقت ہونے والے حالات کے پیش نظر فضل بی بی خود گئی اور موت جس سے وہ خوف زدہ تھی وہیں اس کے تعاقب میں پہنچ گئی۔ بقول آمنہ مفتی:

"اس وقت صحن میں جس قسم کی ہل چل مچی ہوئی تھی اس میں کسی ملازمہ کو پکارنا اور پوتڑے منگوانا، اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حالانکہ موت کو دعوت دو نہ دو، وہ تو اپنے وقت پہ خود بخود چلی آتی ہے۔ کوئی بکتر بند گاڑی، کوئی تعویز، کوئی گنڈا، کوئی دم، کوئی درود کچھ کام نہیں آتا۔ آتی ہے اور چھپر اکھاڑتی، جوڑیاں توڑتی، گودیں اجاڑتی، خاک اڑاتی، اپنی بھینٹ لے کے چلتی بنتی ہے۔"(25)

انسانی فطرت ہے کہ اس کے پاس جو موجود نہیں ہوتا ہے اگر کبھی کسے طریقے وہ مل جائے تو وہ اس کو بھی بھول جاتا ہے جو اس کے پاس پہلے سے تھا ایسا ہی کچھ حال شاماں اور مینے کی زندگی میں ہو رہا تھا۔ شاماں کے جذبات کا اظہار آمنہ مفتی ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"شاماں کو اسرار ملا تو وہ مینے کو بھول گئی۔ مینے کے کپڑے ایک ایک کر کے سب میلے ہو گئے سفید کرتے، نیلی قمیض اور خاکی چولا۔ کمونا ئین صبح جو روٹیاں تھوپ جاتی تھی، وہی کسی دال ساگ کے ساتھ کھالیتا تھا۔ رات کو سونے آتا تو شاماں اسرار کو جھجھو جھونٹے کرا رہی ہوتی۔ دونوں مل کر ہنستے، اسرار اور شاماں۔"(۲۶)

ہمارے جنگلات اور اس میں پائی جانے والی حیات ہمارے قدرتی وسائل کا ایک حصہ ہیں۔ یہ ہمارے ماحول کا ایک بے حد اہم عنصر ہیں جس طرح ہمیں اپنے رہنے کے لیے زمین پہ اپنا گھر چاہیے ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح ان جنگلی حیات کو بھی رہنے کے لیے پر سکون ماحول اور زمین چاہیے ہوتی ہے جو ہماری ہوس نے دن بدن ان سے چھیننے کی قسم کھالی ہے۔ ہم نہ صرف ان سے ان کے ٹھکانے چھین رہے ہیں بلکہ ان کی پر سکون زندگیوں میں دخل بھی دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"دور جھاڑیوں کے پس منظر میں کچھ کالا سا جانور کھڑا تو تھا لیکن اتنی دور سے کیا پتا چلتا تھا کہ بکری ہی ہے۔ کیا خبر کوئی سرکاری سانڈ ہی نہ ہو، الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لیکن وہ بکری ہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غفور نے تہہ بند کے پلو سے گڑوی نکالی تو آمے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔"(۲۷)

ہم انسان جب قدرت کے عطا کردہ وسائل کے استعمال میں خیانت کرتے ہیں تو قدرت بھی ہمیں پھر اس کی سزا دیتی ہے۔ جیسا کہ باؤ اسرار کے لیے رکھی جانے والی بکری کو جب ذخیرے میں چھوڑ دیا گیا اور مطلع بھی کر دیا گیا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے لیکن ہم انسان کب کسی کی سنتے ہیں۔ نتیجے کے طور پہ خود ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی ہی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"غفورے کی آواز بمشکل دب کے جھنڈ تک پہنچی ہو گی کہ دونوں میمنوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس ٹکر میں اتنی شدت تھی کہ غفور، کمر کے بل گرا اور اس کا تہہ بند کھل گیا۔ آمے کو یہ تماشا دیکھ کر بے حد ہنسی آئی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں کے کویوں سے پانی بہہ نکلا۔ گڑوی آدھی بھر چکی تھی اور پھر اس نے دیکھا کہ دونوں میمنے دانت نکوستے ہوئے غفور کے سینے پہ چڑھ گئے اور ان میں سے جس کے ماتھے پر سفید داغ تھا، منہ کھول کے غفور کی گردن پر لپکا جیسے وہ ہری ہری گھاس کا گٹھا ہو اور اس سے پہلے کہ غفورا اسے جھٹک کے پرے پھینکتا، اس نے غفور کی گردن میں دانت گاڑ دیئے۔"(۲۸)

جب انسان اپنی تہذیب سے ہٹ کر کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے تو پھر اس کے فائدے یا نقصان کا حق دار بھی خود ہی قرار پاتا ہے۔ ایسے ہی جب غفور اور آمے نے بکری کا دودھ دوہنے کی کوشش کی تو جو غفور کا حشر ہوا وہ دیکھ کر آمے نے اپنے حواس کھو دیئے ماحول کے اس منظر کو ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

"چیخوں کو سن کر گاؤں کے کتے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جس کا جس طرف منہ اٹھا، اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ راہب کتے جو گاؤں کی زندگی چھوڑ کر کھیتوں میں سکونت اختیار کر چکے تھے اور کبھی کبھار شوقیہ کسی راہگیر پہ بھونکنے کے علاوہ ترک دنیا پہ عمل پیرا تھے، بھی اس افتاد سے گھبرا کر بھونکنے لگے۔ کتوں کے اس شور کو سن کے گاؤں کی بڑھیوں نے کوٹھوں پہ چڑھ کے کوکیں دینی شروع کر دیں اور کھیتوں میں کام کرتے مرد، درانتیاں اور کسیاں چھوڑ کے گاؤں کی طرف لپکے۔"(۲۹)

آمنہ مفتی اکثر اس ماحول کی بات کرتی ہیں جب فضا صاف تھی جنگل اور اس کی حیات انسان کے شر سے محفوظ تھی۔ ہر قسم کے جنگلی پودے فضا میں ایک عجب سی خوشی کا ماحول بناتے ہیں۔ ایسے ہی اس ماحول کا ذکر آمنہ مفتی ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"فرش پہ تلا تھا بیچ بیچ میں باتھو، اٹ سٹ، جنگلی جئی، کوار اور آک کے پودے بھی تھے۔ یہاں خاموشی اور سکون تھا۔ درختوں کے گرے ہوئے پتوں کے گلنے کی مدھم بو ہوا میں ٹھہری ہوئی تھی اور آتی سردی کی شیر گرم ہوا، لہر در لہر بہہ رہی تھی۔"(۳۰)

آمنہ مفتی فطرت میں پائے جانے والے حسن سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں۔ خاص طور پہ اس وقت کو اپنے تخیل سے بیان کرنے کی کوشش کرتیں ہیں۔ جب فضا صاف ستھری ہوتی تھی اور پرندوں کے لیے ماحول ساز گار ہوتا تھا اور وہ اپنے من موجی ماحول میں خوب اڑانیں بھرتے تھے اور آزاد فضا میں خوب نغمے گاتے تھے۔ مگر جوں جوں آبادی میں اضافہ ہوتا گیا ساتھ ہی ساتھ یہ تمام مناظر صرف خیالات و تصورات تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں کہ پرندے سینکڑوں کی تعداد میں یہاں سے وہاں اڑان بھرتے دکھائی دیں۔ ایسے ہی ایک تخیلاتی منظر پر بحث کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں۔:

"سامنے کی جھاڑیوں میں پھر کھڑ بڑ ہوئی اور پھر سے ایک بیٹر اڑ کے دوسری طرف جھاڑیوں میں جا چھپا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی بیٹر اڑے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پیچھے ٹھہر جانے والوں کے مطابق شائد پانچ سو، یا اس سے بھی زیادہ بیٹر اڑے اور ان جھاڑیوں کو چھوڑ کر دوسری جھاڑیوں میں گھس گئے۔ مینا اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ کچھ برا ہو چکا ہے۔ جھاڑیوں کے پار سے چھپاکوں کی ایسی آواز آ رہی تھی جیسے ایک بڑی جسامت کی مچھلی کسی تنگ جوہڑ یا تالاب میں پھڑ پھڑا رہی ہو۔"(۳۱)

جب تک انسان قدرت کے عطا کردہ نظام زندگی میں دخل انداز نہیں ہوتے ہیں تو ماحول اور حالات انسان کے لیے ساز گار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی انسانی دماغ اپنی خرافاتی چالیں اور اپنے لالچ سے بے بس ہو کر فطرت کے نظام عمل میں دخل اندازی کرتے ہیں تو پھر فطرت بھی انسان کی مخالف ہو جاتی ہے اور طرح طرح کے سمجھ میں نہ آنے والے واقعات رونما ہونا شروع ہو جاتے ہیں ایسے ہی واقع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آمنہ مفتی رقم طراز ہیں:

"ڈرتے ڈرتے وہ آگے بڑھا تو اس نے کسی انسان کو پشت کے بل زمین پہ گرے دیکھا۔ یہ غفور آرے والا تھا۔ بکری ایک طرف کھڑی لا تعلقی سے گھاس چر رہی تھی۔ جس منظر نے مینے کے ہوش اڑا دیئے وہ یہ تھا کہ دونوں پٹھورے غفور آرے والے کے موٹے موٹے بازوؤں اور رانوں کو بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھا رہے تھے۔ بالکل ایسے جیسے دو بھوکے شیر اپنے شکار کو بھنبھوڑ رہے ہوں۔"(۳۲)

انسان جب اس دنیا میں آیا تو اس کے لیے اس ماحول میں فطرت کے انواع و اقسام کے انعامات موجود تھے انسان نے جب تک اس نظام میں کوئی دخل اندازی نہیں کی تو ہر چیز موثر انداز میں اپنے اپنے مدار میں چلتی رہی لیکن جیسے ہی آہستہ آہستہ انسان نے قدرت کے بنائے گئے مدار کو اپنے تابع کرنے کی سعی کی تو اس کی ہوس نے اس کے اپنے لیے بھی مسائل کے ان گنت انبار لگا دیے۔ انسان جب اپنے حصے کو چھوڑ کر دوسرے کے حصے پر بھی قابض ہونے کی دھن میں لگ گیا تو زوال کا سلسلہ بھی وہیں سے چل نکلا ایسے ہی منظر کی عکاسی کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"یہ سب تب ہوتا ہے جب اپنا حصہ چھوڑ کے میرے حصے کی فکر ہو جاتی ہے۔ تیرے لیے جنگل ہیں بیلے ہیں، تیرے پالتو جانور ہیں جو سب قدرت رکھتے ہوئے بھی تجھے کچھ نہیں کہتے، تیرا پیٹ ہی بھرتے رہتے ہیں۔ اگر سانپوں، سیہوں، سوؤروں، گوہوں، چھچھوندروں کے لئے، میرے لئے، اتی سی، بس چپہ بھر جگہ چھوڑ دی گئی ہے تو تو وہاں بھی گھس آیا؟ اور کسی بے غیرت نے تجھے نہ روکا؟ تو میاں اللہ یار نہیں ہو سکتا۔۔۔ نہ!! "جوگی نے زبان ٹخٹخائی اور گرے ہوئے درختوں کے تنوں کو پھلانگتا، گھاس کے قطعوں کو الانگھتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے غائب ہو گیا۔"(۳۳)

آمنہ مفتی جس قسم کے ماحول کو بیان کرنا چاہتی ہیں۔ وہی ماحول اپنے ناول میں پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے یہاں ناول "پانی مر رہا ہے" میں وہ صبح کے وقت کے منظر کو بیان کرتے ہوئے ان الفاظ کا چناؤ کرتی ہیں:

"ڈھاکے سے آئی خوشبودار چائے، جو سفید پیالیوں میں انڈیلی جاتی تو پورا کمرہ اس کی خوشبو سے بھر جاتا تھا اور کھڑکی پہ چونچیں مارنے والے شکر خوروں کا غول بھی جیسے اس خوشبو سے مست ہو کر مار ننگ گلوری کی بیلوں میں جا گھستا تھا جہاں پورا غول چائے ختم ہونے تک چاندی کی گھنٹیوں کی سی مہین مہین آوازیں نکالتا رہتا۔"(۳۴)

آبادی میں ہونے والے بے تحاشا اضافے کی وجہ سے ہم بنیادی مسائل کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اور زندگی گزارنے کے لئے جو نعمتیں درکار ہیں ان قدرتی نعمتوں کا بھی دن بدن خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے انسان نے قدرت کے عطا کردہ وسائل کے سرمائے میں دخل اندازی کی۔ قدرت کا انتقام اس اس چیز کے وسائل کے کم ہونے یا چھن جانے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس حوالے سے کچھ اس انداز سے بحث کرتی ہیں:

"عرفان صاحب، اپنی کلیم شدہ زمین دیکھنے گئے تو انہیں شدید مایوسی ہوئی، ریت جھاڑیاں اور ٹوبے، ٹیلے۔ دور تک تو وہ گئے ہی نہیں، وہیں کنارے سے مٹی اٹھائی، سونگھی، دیکھی اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ گئے۔ زیر لب کچھ کلمات بھی کہے، جنہیں عیار پٹواری نے اپنی ذہنیت کے مطابق ڈی کوڈ کر کے ذہن میں محفوظ کر لیا۔"(۳۵)

آمنہ مفتی اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں تقسیم کے بعد کے ماحول کو بیان کرتے ہوئے پانی کے حوالے سے درپیش مسائل کا ذکر کر رہی ہیں۔ کہ دونوں ملکوں کو تقسیم کے بعد دریاؤں کے رفتہ رفتہ خشک ہو جانے کے بعد پانی کی کمی کا سامنا ہے اور پانی کی کمی کی وجہ سے فصلیں بھی وقت پہ نہ تو بو سکتے ہیں نہ کاشت کاری کر سکتے ہیں۔ مگر پریشانی کی بات یہ ہے کہ اگر ہم بر وقت اس کا حل نہیں نکالتے ہیں تو ہم مکمل طور پہ کوئی فصل کاشت نہیں کر سکتے اور دن بدن بڑھنے والی آبادی کی خوراک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں پانی کی اشد ضرورت ہے اور اگر ایسا نہیں ہو تا تو حالات بہت خراب ہو جائیں گے۔

بقول آمنہ مفتی:

"سرحد کے آر اور پار دونوں ملک جان توڑ کوشش کر رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ علاقے تک پانی پہنچا کر زمین کو قابل کاشت بنا دیا جائے کیونکہ ان کی فوطوں میں آنے والی بھوکی نسلوں کے بے شمار جرثومے کلبلا رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اگر ہر ہر کھیت سے بے شمار خوراک پیدا نہ کی گئی تو یہ ٹڈی دل ایک روز، مارے بھوک کے ایک دوسرے کو کھا جائیں گے اور اگر پھر بھی پیٹ نہ بھرا تو زمین کھود کر اپنے بڑوں کی ہڈیاں تک نکال کر کھا جائیں گے۔[۳۶]

ماحول کے بگاڑ میں جہاں دیگر عوامل شامل حال ہوتے ہیں۔وہاں انسانی سرگرمیاں بھی ماحول کو بگاڑنے میں پیش پیش ہوتی ہیں اور جب بگاڑ کا نہ تھمنے والا سلسلہ چل نکلتا ہے تو کئی محیر العقول واقعات ہوتے ہیں کہ جن کو نہ تو عقل تسلیم کرتی ہے نہ شعور مگر ایسے ہی واقعات پہ روشنی ڈالتے ہوئے آمنہ مفتی کہتی ہیں:

"دریا والی بات تو بہت بعد میں ہوئی پہلے تو مچھلیوں نے انسانی گوشت چکھا اور جوہڑوں میں رہنے والے کچھوؤں کی آنکھیں انسانی خون سے چیچپا گئیں اور گدھ اور کوے گھبرا گھبرا کے اتنا کھا گئے کہ ان کے پیٹ پھٹ گئے اور ان کی لاشوں کو کھانے والا کوئی نہ بچا۔ لیکن کوئی زلزلہ نہ آیا، کوئی سیلاب نہ آیا۔ آسمان پہ کسی طرح کے پرندوں کا کوئی جھنڈ نمودار نہ ہوا۔ آندھیاں معمول کے مطابق چلتی رہیں اور سورج کی تپش آدھا درجہ بھی آگے پیچھے نہ ہوئی۔ آسمان اور زمین اپنی جگہ قائم رہے، نہ سورج زمین کو پکڑ سکا اور نہ زمین نے اپنی جگہ چھوڑی۔"[۳۷]

آمنہ مفتی فطرت کا بہت ہی قریب سے بغور مطالعہ کرتی ہیں اور ہر، ہر موسم پہ نظر رکھتی ہیں کہ کون سا موسم کون سے رنگ بکھیرتا ہے اور اس کے جوبن پہ کیا کچھ نیا پن سامنے آتا ہے اور ایسے میں بہار کا موسم تو چار چاند لگ دیتا ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں باغوں میں جھولے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ایسے محسوس ہوتا ہے زندگی میں کچھ نیا پن آگیا ہے۔ایسے ہی حسین منظر کی عکس بندی کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

"سامنے باغ میں بہار آچکی تھی اور پھل دار درختوں پہ بور مہک رہا تھا۔ کیسا ظالم موسم تھا، ہر ہر شے سے روئیدگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں پہ مخملیں پتے سر اٹھا رہے تھے، جو درخت خزاں کے جاتے ہی پتے جھاڑ کے فارغ ہو گئے تھے، وہ اب مکمل ہرے تھے۔ پھولوں کا تو خیر شمار ہی ممکن نہ تھا اور ہوا میں سبزے اور رنگ برنگے پھولوں اور ان کے ریز دانوں سے اٹھتی مہک ایک پاگل کر دینے والی باس بن کر ٹھہری ہوئی تھی۔"(۳۸)

آمنہ مفتی اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں اس وقت کے ماحول کی بات کر رہی ہیں۔ جب ماحول ہر قسم کی کثافت سے پاک تھا اور انسان فطرت کے عطا کیے گئے خوب صورت رنگوں سے خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایسے ہی دل کش منظر کا ذکر مدھو کے اور اس کے لان کے موسم بہار کے حوالے سے یہاں کیا گیا ہے۔:

"برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے وہ لان میں آگئی۔ آسمان پہ بہار کے بادل پھیلے ہوئے تھے۔ مدھو نے دھریک کی ایک جھکی ہوئی شاخ سے ایک چھوٹا سا گچھا توڑ لیا اور سر جھکا کے اس گچھے کو سونگھا۔ اس خوشبو نے اسے وہاں سے اٹھا کے سکول کے دنوں میں پہنچا دیا۔ کتنے بے شمار درخت تھے ۔ صدر دروازے سے لے کر اس کی جماعت کے کمرے تک، کاسنی کاسنی پھولوں سے سڑک ڈھک ہوئی تھی اور یہ ہی پاگل کر دینے والی خوشبو ہوا میں ٹھیری ہوئی تھی۔ وہ بلا وجہ مسکرائی اور پھولوں کا گچھا ساڑی کے بروچ میں اڑس لیا، زمین و آسمان، پیڑ پودے، سب کچھ کتنا نیا تھا ابھی ابھی "کن" کی گونج ختم ہوئی تھی اور ابھی ابھی سارے رنگوں نے جنم لیا تھا۔"(۳۹)

سندھ طاس معاہدہ کے بعد پاکستان کے دریائی اور نہری نظام میں جو جو تبدیلیاں کی گئی اور کس کس انداز میں کی گئی اور ان کے نتیجے کے طور پہ ہونے والے نقصانات کا خمیازہ بھی حضرت انسان کو ہی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس کی بہت اچھے سے مثال مصنفہ نے اپنے ناول میں واضح طور پہ بیان کی ہے۔ لکھتی ہیں:

"دریا میں اپنا ہی پانی بہتا ہے۔ یہ دیکھو یہ میرا بازو ہے، میری رگیں، میری وریدیں ان میں میرا خون بہتا ہے، میرا ایک بلڈ گروپ ہے ایک بلڈ کمپوزیشن ہے۔ تم مجھ سے اور

میں تم سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کریں اگر میرا سب خون نچوڑ کے تمہارا خون مجھ میں
ڈال دیا جائے تو کیا ہو گا؟ نہ تم بچو گی نہ میں اور اگر ہم دونوں بچ بھی گئے تو تم کب تک
اپنا خون مجھ میں ڈالتی رہو گی؟ پھر ہم سوائے خون کے تبادلے کے اور کیا کر پائیں گے
شاہدہ؟ سوچو؟ سوچو، ایسا انسان جس میں کسی دوسرے کا خون ہو اور وہ انسان جس کا
خون مسلسل دوسرے انسان کو دیا جا رہا ہو، کیا وہ دونوں انسان زندہ ہوں گے؟ اور اس
زندگی کو تم زندگی سمجھو گی؟"(۴۰)

ماحولیاتی عناصر انسانی صحت کے لیے بہت ہی زیادہ اہم ہیں اور صرف انسان ہی کیوں اس روئے زمین پہ پائے جانے والے تمام جان داروں کے لیے ماحولیاتی عناصر ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی جان لیوا ہے اس لیے جب پانی ختم ہو جائے گا تو انسانی زندگی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ قدرت کو درپیش ایسے ہی مسائل پہ بحث کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں۔:

"عرفان صاحب نے شاہدہ کے ہاتھوں کو اپنے سرد ہاتھوں میں زور سے دبوچ لیا۔
انہیں آکسیجن چاہیئے تھی، تازہ ہوا۔ ہوا، پانی، خوراک انسان کی بنیادی ضروریات
ہیں۔ صرف انسان کی ہی نہیں سبھی جانداروں کی بنیادی ضرورت دریا میں بھی تو پانی
ہوتا ہے اور پانی کیا ہوتا ہے یہ عرفان صاحب کو اب معلوم ہونا شروع ہوا تھا جب
سندھ طاس منصوبے پہ دستخط ہو چکے تھے۔ تین بڑے ڈیم، کئی بیراج، رابطہ نہریں اور
نہروں کے موگھے اور نالے اور نالوں میں بہتی ہوئی ننھی ننھی مچھلیاں، جن پہ سفید بگلے
گھات لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور اکانہہ کے مڈھ میں ایک باگڑ بلا خوف سے پھولا ہوا
کھڑا تھا اب، اب ان پہ یہ راز کھلا کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ دریا سوکھ رہا تھا۔ دریائے
بیاس کا مغربی حصہ جو اپنڈکس کی طرح دریاؤں کے اس قدرتی نظام میں اک طرف کو
پڑا تھا، سوکھ رہا تھا۔"(۴۱)

آمنہ مفتی ماحول کے اندر پائی جانے والی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا احساس رکھتی ہیں اور ذرا سی تبدیلی کو بھی بہت زیادہ محسوس کرتی ہیں۔ زندگی گزارنے کے لیے جس فطری اور صاف ماحول کی انسان کو روز ازل سے ضرورت رہی ہے اور آج کے دور میں بھی انسان کی زندگی کی ضمانت وہی ہے ان سب کا ذکر ہمیں آمنہ

مفتی کے ناولوں میں جا بجا ملتا ہے۔ بادل، بارش، ہوا، پانی، موسم سب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"آسمان پہ بہار کے بادل جمع ہو رہے تھے سفید بادل جن کے کنارے سورج کی چمک سے نقرئی ہو رہے تھے اور ان بادلوں کو ڈھانپنے کو سیاہ بادلوں کا ایک بڑا سا گروہ شمال سے چلا آرہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور روئیدگی کی خوشبو۔ کائنات جو ابھی ابھی بنی تھی، اس کے ہر کونے سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔ زندگی جو شکست نہیں مانتی، جو چلتے رہنا چاہتی ہے، اپنا تسلسل قائم رکھنے کو ہر ڈھنگ اپناتی ہے۔ وہی زندگی ہرن کے نافے سے اٹھتی خوشبو کی طرف ہر کونے کھدرے سے سر اٹھا رہی تھی۔"(۴۲)

ماحولیاتی عناصر کا استعمال آمنہ مفتی کے ہاں بہت ہی اعلیٰ انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ موسم بہار کی آمد اور اس موسم میں پھولوں اور پھلوں کا دل کش نظارہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ہوا کا ایک جھونکا آیا اور آم کے بور کی خوشبو کا بھپکا مدھو کی ناک سے ٹکرایا۔ اف اس خوشبو سے دانتوں میں کیسی چل سی اٹھی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ کچھ نہیں تو یہ سامنے بیٹھے عرفان صاحب کے موم سے بنے شانے میں ہی دانت گڑو دیئے جائیں۔"(۴۳)

آمنہ مفتی اکثر بدلتے ہوئے موسم اور حالات کے ذریعے اپنے گرد و پیش میں ہونے والے واقعات سے روشناس کروانے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ ایسے ہی اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں وہ اچانک ہونے والی برسات اور گرج چمک اور ماحول میں ہونے والے اس کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"کنج میں درخت کے نیچے گھنا اندھیرا تھا۔ اسی وقت بادل بہت زور سے گرجا۔ بجلی کی چمک سے سارا باغ چکا چوند ہو گیا۔ ایک بار پھر زور کا کڑاکا ہوا اور مدھو ڈر کے عرفان صاحب سے چمٹ گئی۔ پھر تین بار بجلی اور چمکی اور جب تیسری بار کڑکی تو اس کڑک میں ایسا شور تھا کہ مدھو کو لگا اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔"(۴۴)

معدنیات، حیوانات، نباتات، جنگلات، ہوا، پانی، شجر، حجر، چرند، پرند، قدرتی وسائل اور انسان ملتے ہیں تو ماحول تشکیل پاتا ہے۔ یہ تمام ماحول کے فطری اجزاء ہیں اور جب تک یہ تمام فطرت کے قوانین کے مطابق کام کرتے رہے نظام فطرت بخوبی چلتا رہا مگر جیسے ہی انسان نے اس کو اپنے زیر کرنے کی کوشش شروع کی تو فطرت کے نظام میں دخل اندازی کرنے پہ نت نئے حیران کن واقعات رونما ہونے لگ گئے۔ بے وقت کی بارش، موسمیات کی تبدیلی اور کئی اور عوامل منظر عام پہ آنے لگے۔ ایسے ہی ایک منظر کو آمنہ مفتی نے کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے:

"آسمان سے پانی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں گر رہی تھیں جن کی آنکھیں کسی ازلی اورابدی حیرت میں چری ہوئی تھیں اور وہ اپنے ننھے ننھے منہ بار بار کھول رہی تھیں، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں، صدیوں کے ارتقا کے سفر میں انسان نے اپنی زبان جانوروں سے الگ کر لی تھی۔ مچھلیاں ایک کے اوپر ایک گرتی رہیں۔ منہ کھولتی بند کرتی، اپنی حیرت بھری آنکھوں سے شاہدہ کو دیکھتی۔"(۴۵)

انسان کی قدرت کے عطا کردہ نظام میں مداخلت قدرت کو سخت ناپسند آئی اور اسی وجہ سے جس طرح انسان نے قدرت کے عطا کردہ نظام میں مداخلت کر کے اس کو اپنے لالچ کی بھینٹ چڑھایا ٹھیک اسی طرح فطرت نے بھی اپنا انتقام لینا شروع کیا اور اس کی ایک جھلک آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" کے ذیل کے متن میں موجود ہے:

"باغ کے درخت گرمی سے جھلسے ہوئے تھے۔ گھاس گو کٹی ہوئی تھی لیکن اتنی ہری نہ تھی، کیاریوں میں نئے پھول نہ بوئے گئے تھے اور پچھلے پھول آسمان سے گرنے والی ان مچھلیوں کے صدمے سے مسلے گئے تو پھر سر نہ اٹھا سکے۔ اب ان کیاریوں میں مالی درختوں سے گرنے والے پتے اور دیگر خاشاک ڈال دیا کرتا تھا اور فرصت ملنے پر کھرپی سے نلائی کر دیتا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ یہاں پھر کبھی نئے پھول بوئے جائیں گے۔ گل داؤدی، گلاب، گیندا، کلغا اور گل خیرہ۔ اسی امید پر وہ مردہ پتوں کے اجسام ان کیاریوں میں دبا رہا تھا۔"(۴۶)

آمنہ مفتی نے اپنے ناول میں فرد کی ہوس کی وجہ سے ہونے والی ماحولیاتی تبدیلی اور اس کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لان کے بیچوں بیچ آسمانی بجلی سے جلے ہوئے گارڈن ہاؤس کا کھنڈر ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی دھوپ کا رنگ بھی کچھ ماند سا پڑ گیا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پہ بارش کی بوندوں سے جو گدلاہٹ جمی تھی اسے صاف کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آیا۔ اس دن پے در پے رونما ہونے والے واقعات نے سب کو ایسا شل کیا تھا کہ ابھی تک کچھ بھی معمول پر نہ آسکا تھا۔ آسمان سے گرنے والی مچھلیوں کو شاہدہ کی تدفین سے پہلے ہی نہایت خاموشی سی اٹھا کر شاگرد پیشے کے سامنے موجود ایک غرقی میں ڈال دیا گیا تھا۔"(۴۷)

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے بہت سی ایجادات تو کرلی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کائنات میں پائے جانے والے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھالیا ہے اور ہم بہت ترقی کر گئے ہیں، مگر در حقیقت ہم اپنے لالچ کی وجہ سے اپنے ہاتھوں اپنے پانی کے ذخائر کو نست و نابود کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔ دریا جو اپنی گزرگاہ پہ موجود تھے اور انسان کو فائدہ پہنچارہے تھے ان کے پانی کو بھی تقسیم کرنے کے نقشے بنا لیے اور یہ بھول گیا انسان کہ یہ تو قدرت کی عنایت ہیں۔ ان دیئے گئے انعامات کی ناقدری اس کو مہنگی پڑے گی۔ ان ہی خیالات پہ بحث کرتے ہوئے آمنہ لکھتی ہیں:

"سٹڈی میں سب طرف بڑے بڑے نقشے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر، کتابوں کی الماریوں پر حتیٰ کہ فرش پر نقشے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ نقشے کوئی جغرافیائی یا سیاسی نقشے نہیں تھے یہ نقشے اصل میں پلان تھے۔ آب پاشی کے اس عظیم ترین نظام کے نقشے جس نے وادی سندھ کی تقدیر بدل ڈالنی تھی۔ اس منصوبے کے نقشوں کے ساتھ ساتھ وہاں ایک دوسرے منصوبے کے نقشے بھی لگے ہوئے تھے۔ سندھ طاس کے منصوبے کے نقشے، سات رابطہ نہریں، تین ڈیم، کئی بیراج اور تین دریا۔"(۴۸)

بڑھتی ہوئی آبادیوں کو رہائش کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے دن بدن جنگلات کے بے دریغ کٹاؤ کی وجہ سے آلودگی کی مقدار بھی فضا میں بڑھتی گئی اور اس بڑھتی ہوئی آلودگی کی وجہ سے ماحولیاتی تبدیلیاں بھی ہونے لگی ہیں ان کا ذکر کچھ ان الفاظ میں آمنہ مفتی کرتی ہیں:

"وہ رات بھی عجیب تھی دن بھر آسمان پہ گرد کی موٹی تہہ چڑھی رہی جو نومبر کے مہینے میں ایک عجیب بات تھی۔ سہ پہر سے آسمان لال ہونا شروع ہوا اور پھر ایسی زور دار آندھی چلی کہ لان میں کھڑا آم کا کہن سال درخت جڑوں سے اکھڑ کے وہ جا کے گرا۔ درختوں کی شاخیں، چٹ چٹ ٹوٹیں، بر آمدوں میں رکھی کرسیاں وحشی ہواؤں کے ساتھ ادھر سے ادھر ہو گئیں۔ کھلی کھڑکیوں کے پٹ آندھی کے ساتھ اکھڑ کے کہیں سے کہیں جا پڑے اور سارے میں جیسے چنڈی دھمال ڈال گئی۔"(۴۹)

آمنہ مفتی کے اس ناول میں دیکھا جائے تو انہوں نے ماحول کو بہت ہی خوب صورتی کے ساتھ ترتیب وار پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمارا رہن سہن اس کے ساتھ ہمارا ماحول اور ہمارے ماحول میں ہمارے ہاتھوں ہونے والے بگاڑ کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہاں انہوں نے اپنے ناول میں مختلف جانور جو بس دریا کے پانی میں ہی زندہ رہ سکتے ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

"ان پانیوں میں عجیب جانور پیدا ہوئے۔ ایسے جانور جو اور کسی دریا میں جی نہیں سکتے تھے۔ صرف اسی دریا کے سرخی مائل پانیوں میں ان کی بقاء تھی۔ ان جانوروں میں انسان سے مشابہہ بلھن بھی تھی، مونچھوں والے کچھوے بھی، مچھلیوں کی کئی نایاب قسمیں میٹھے پانی کے جھینگے اور سرخ کیکڑے، گھونگھوں کی لاتعداد قسمیں، کیچڑ میں کیمو فلاج ہو جانے والے آبی جانور اور مگرمچھ۔"(۵۰)

یہاں آمنہ مفتی اپنے اطراف میں پائے جانے والے بے حد خوب صورت مناظر کا بیانیہ کچھ اس انداز سے پیش کرتی ہیں:

"دریا کے کناروں پہ رنگ رنگ کے درخت اگے، جن کی جڑوں کو صرف اسی دریا کے پانی کی نمی چاہیے تھی۔ ان پہ جو پھل پھول لگتے تھے وہ بظاہر دوسرے دریاؤں کے کنارے پائے جانے والے نباتات جیسے ہی تھے، لیکن یہ بات اب صرف مسز بتر ادہرا

رہی تھیں کہ ان نباتات کے رنگ، خوشبو اور ذائقے میں ایک نہایت لطیف فرق تھا، جو باقیوں سے انہیں ممتاز کرتا تھا۔ ان درختوں پہ رہنے والے طیور کے پروں اور چونچ کے رنگ اور بناوٹ بھی اسی طرح فرق تھے۔"(۵۱)

آئے روز ہونے والی ترقی نے جہاں ہمارے لیے زندگی آسان سے آسان تر بنادی ہے، وہاں ہی انسانی طمع نے آس پاس کے ماحول کو بھی برباد کر کے رکھ دیا ہے اور اس کی سزا اس صورت سامنے آرہی ہے کہ طرح طرح کی چیزیں، اور تبدیلیاں سامنے آرہی ہیں:

"تو ان مخلوقات میں سے جو اس دریا کے سرخی مائل گدلے پانی میں پیدا ہوئی تھی ایک مخلوق وہ بھی تھی جس کا آدھا بدن لڑکی کا اور بدن مچھلی کا تھا۔ مچھلی کا بدن ایسا نہیں تھا جیسا عام مچھلیوں کا ہوتا ہے۔ یہ بدن تو ایسا تھا جیسے کوئی بیلے ڈانسر دونوں ٹانگیں جوڑ کے پنجوں پہ تنی کھڑی ہو اور ان باہم پیوستہ زانوؤں اور پنڈلیوں پر کسی مشتاق درزی کا سیا ہوا چانوں سے بھرا لبادہ کس دیا گیا ہو۔ جس سے اس کے زانوؤں کے ابھار اور کولہوں کے بوجھل پن مزید نمایاں ہو گیا ہو اور اس کا اوپری بدن جو ایک لڑکی کا جسم تھا۔"(۵۲)

آمنہ مفتی یہاں پہ انسان کا اس کے ماحول کے ساتھ کیا رشتہ ہے اور اس رشتے کو وہ کب کیسے اور کس طرح نبھارہا ہے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"انسان بہت بودا ہے۔ بے وقوف اور سرکش۔ اسے دریاؤں کے بہاؤ سے نفرت ہے اسے چلتی ہوائیں اسے بری لگتی ہیں۔ اسے پرندوں، جانوروں، حشرات الارض سے جان کا خوف ہے۔ پھر یہ جب سب کو مار ڈالتا ہے تو ایک دوسرے کو بھی مار ڈالتا ہے۔ اس کو خود پہ مان ہے، لیکن میرے بھائی! دریا منہ زور ہوتے ہیں۔ اپنی طاقت کے نشے میں انسان سے بھی زیادہ مست۔ یہ جو تم لوگ دریاؤں کو بند باندھ رہے ہو، جانتے ہو کیا ہو گا؟"(۵۳)

بظاہر دیکھا جائے تو انسان کی اوقات کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے علم اور عقل کی بدولت دریاؤں کے راستے کو بدلنے پہ تلا بیٹھا ہے وہ چرند پرند ہر چھوٹے بڑے جان دار، بے جان اجسام کو ختم کر سکتا ہے اور وہ ایسا کرتا بھی ہے مگر وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی اپنی بھی ان کے سامنے کوئی اوقات نہیں ہے اور انسان جب ان اشیاء پہ تسلط قائم کر لیتا ہے تو پھر وہ خود ایک دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ یوں بگاڑ کا وہ سلسلہ جس کی ابتدا آپ نے کی اختتام بھی آپ پہ ہی ہو گا۔

حوالہ جات

۱۔ غلام حسین ساجد، پانی مر رہا ہے، ایک تجرباتی ناول،
https://www.humsub.com.pk/189343/ghulam.hussain.sajjad/، ۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء

۲۔ غلام حسین ساجد، پانی مر رہا ہے، ایک تجرباتی ناول،
https://www.humsub.com.pk/189343/ghulam.hussain.sajjad/، ۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ اقبال خورشید، سال ۲۰۱۹ء میں طلوع ہوتی کتابیں،

https:// www.dawnnews.tv/news.tv/news/1116683، ۱۷ دسمبر ۲۰۱۹ء

۶۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفیصل ناشران، لاہور، پاکستان، 2018، ص 3۔

۷۔ ایضاً۔ ص ۳

۸۔ ایضاً، ص ۳

۹۔ ایضاً، ص ۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۶۔۱۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۹

۲۵۔ ایضاً، ص۳۱

۲۶۔ ایضاً، ص۳۴

۲۷۔ ایضاً، ص۳۷

۲۸۔ ایضاً، ص۳۷۔۳۸

۲۹۔ ایضاً، ص۳۸

۳۰۔ ایضاً، ص۴۰

۳۱۔ ایضاً، ص۴۱

۳۲۔ ایضاً، ص۴۱

۳۳۔ ایضاً، ص۴۲

۳۴۔ ایضاً، ص۴۸

۳۵۔ ایضاً، ص۵۳

۳۶۔ ایضاً، ص۵۳

۳۷۔ ایضاً، ص۵۴

۳۸۔ ایضاً، ص۵۹

۳۹۔ ایضاً، ص۵۹

۴۰۔ ایضاً، ص۶۳

۴۱۔ ایضاً، ص۶۴

۴۲۔ ایضاً، ص۶۵

۴۳۔ ایضاً، ص۶۶

۴۴۔ ایضاً، ص۶۷

۴۵۔ ایضاً، ص۶۷

۴۶۔ ایضاً، ص۷۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۲

۴۸۔ ایضاً، ص ۷۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۷۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۷۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۷۹

۵۲۔ ایضاً، ص ۸۰

۵۳۔ ایضاً، ص ۸۷۔۸۸

باب چہارم:

آمنہ مفتی کے ناولوں کا ماحولیاتی تانیثی مطالعہ

الف۔ ماحولیاتی تنقید اور تانیثیت:

ماحولیاتی تنقید قدرتی ماحول اور ادب کے ان رشتوں کی بات کرتی ہے جو اس طرف اشارہ کرتی دکھتی ہے کہ کیسے ہم انسان اپنے ماحول کی بقاو سلامتی کے لیے اقدامات کر سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انسانوں نے جیسے ہی جانوروں کو اپنے زیر تسلط کیا اور کھیتی باڑی شروع کی تو اس کے اندر فطرت کے بنائے گئے نظام میں مداخلت کرنے کی جو کوشش شروع ہوگئی تھی وہ دھیرے دھیرے بڑھتی گئی۔ انسانی لالچ دن بدن بڑھتا گیا اور اس بڑھتے لالچ اور ہوس نے انسان کے اپنے ہی ہاتھوں سے اس کے ماحول کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی تو رہائش اور دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے انسان نے جنگلات کا بے دریغ کٹاؤ شروع کیا۔ انسان پہلے سے موجود درخت، پیڑ، پودوں کا تو خاتمہ کرتا رہا مگر نئے لگانا بھول گیا۔ جس کا خمیازہ اس کو ماحول کی آلودگی کی صورت میں بھگتنا پڑھا۔ اس نقصان کو جہاں دیگر مکتبہ فکر نے محسوس کیا وہاں ادبی فن پاروں میں بھی اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ جبکہ باقاعدہ طور پہ اس کی ابتدا 80ء اور 90ء کی دہائی میں ہوئی۔

تانیثیت یا فیمینزم ایک ایسی تحریک ہے جس میں عورتوں کے حقوق اور ان پہ ہونے والے ظلم و جبر اور استحصال کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے آغاز و بنیاد کی بات کریں تو اس کے عالمی سطح پر متعارف ہونے سے پہلے ہی اس کی شروعات مغربی یورپ سے ہو چکی تھی اور تانیثیت کے علمبرداروں کینڈورسٹ(Candogest)، ہال بیک(Halbeck) اور ہولڈ برگ (Hold Burg)نے اٹھارہویں صدی کے شروع میں عورتوں کے بنیادی حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور پھر یہ ہی آواز یورپ سے ہوتی ہوئی فرانس سے باقاعدہ طور پر ایک تحریک کے طور پہ سامنے آئی اور "اس کی ابتدا کا سہرا فرانس کے چارلس فوریئر (Charles Fourier)کے سر پہ ہے۔ اس تحریک کو فیمینزم و فیمینسٹ کے نام سے پکارے جانے کی ابتدا بھی نیدرلینڈ اور فرانس سے ہی ہوئی" اور 1895ء میں یہ الفاظ آکسفورڈ ڈکشنری کا حصہ بنے۔ جلد ہی یہ تحریک عالمی سطح پہ چھا گئی اور اس کی کئی شاخیں وجود میں آنے لگی۔ بریٹینیکا میں تانیثیت کا تعارف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "Feminism,the belief in the social,economic and political equality of the sexes. Although largely originating in the West, feminism is manifested

worldwide and is represented by various institutions committed to activity on behalf of women's rights and interests."[1]

اس تحریک کے علمبرداروں کی کوششیں رنگ لے آئی اور خواتین پہ ہونے والے ظلم وستم اور استحصالی رویے کا خاتمہ ہونے لگا۔ ان کو ان کا حق ملنے لگا، درسگاہیں بننے لگیں، ووٹ کا حق بھی اسی تحریک کی وجہ سے عورتوں کو ملا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تانیثیت بہت ہی جلد ایک عالمی تحریک بن کر ابھری اور دنیا کے زیادہ تر مرد و زن اس میں شامل ہوتے گئے اور یہ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ اردو ادب میں بھی تانیثیت کے حوالے سے نہ صرف بات کی گئی بلکہ دیگر ممالک کی طرح یہاں بھی یہ بطور تحریک منظر پہ آئی۔ تانیثیت کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر وہاب اشرف لکھتے ہیں:۔"عورت کے لئے قائم کردہ مردانہ ذہنیت سے نکلنے کا نام تانیثیت ہے"[۲] ڈاکٹر شہناز نبی تانیثیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں: "فیمینزم تحریکات کے مجموعے کا نام ہے جس کا مقصد عورتوں کو مردوں کے برابر سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق دینا ہے۔"[۳] انیس ہارون تانیثیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔"خواتین پر ظلم وزیادتی کے خلاف آواز اٹھانا یا ان کے حقوق کی بات کرنا فیمینزم ہے۔"(4) جیسے جیسے تانیثیت کی تحریک عالمی شکل اختیار کرتی گئی تو اس کی بہت سی شاخیں وجود میں آ گئیں۔ ان میں سے چند اہم شاخیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حریت تانیثیت(Liberal Feminism)

۲۔ مارکسی تانیثیت(Marxist Feminism)

۳۔ انتہا پسند تانیثیت(Redical Feminism)

۴۔ تحلیل نفسی تانیثیت(Psychoanalytic Feminism)

۵۔ سماجی تانیثیت(Social Feminism)

۶۔ وجودی تانیثیت(Existentialist Feminism)

۷۔ مابعد جدید تانیثیت(Post Modern Feminism)

۸۔ ماحولیاتی تانیثیت(Eco Feminism)

انسان اور ماحول کے مابین بہت ہی گہرا تعلق ہے۔یہاں تک کہ انسان کا رشتہ اس کے ماحول کے ساتھ اس دنیا میں آنے سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے اور جس ہستی کی وجہ سے اس کا ماحول سے تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ ماحول کے اثر کو قبول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔وہ اس کی ماں یعنی معاشرے میں پائی جانے والی ایک عورت ہی ہوتی ہے۔مگر یہ ہی انسان(مرد)جب طاقت ور ہو جاتا ہے تو ماحول اور اس میں پائی جانے والی ہر شے پہ حکمران بننے کی حکمت عملی بننے لگتا ہے اور اس کے لیے اس کو جبر و تشدد بھی کرنا پڑ جائے تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے اور ان حالات کی ابتدا کب ہوئی شاید ہی تاریخ بھی یہ نہ بتا سکے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں آنے والے شاید اولین انسان نے ماحول اور عورت پہ جب جبر و تشدد اور اس کے حقوق کا استحصال کیا ہو گا تو اس میں اتنی توانائی نہیں ہو گی کہ وہ اس کو روک سکے تو اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے سبزے کو پاؤں تلے روندنے سے لے کے تاروں پہ کمند ڈالنے تک کئی صدیوں کا سفر طے کیا اور اسی سفر میں عورت انسانوں کی صف سے نکل کر خود کو ماحول کا حصہ سمجھنے لگی اور خود کو فضا میں اڑتے پرندوں اور باڑے میں بندھی بھیڑ بکریوں کی طرح کمزور ولاچار خیال کرنے لگی اور پھر ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس کو تشبیہ دینے کے لیے پھول، حشرات الارض، کلیوں سا کہنا شروع کر دیا مگر صدیوں عورت اور ماحول کا یہ تعلق گم نام ہی رہا۔لیکن بیسویں صدی کے آخری نصف میں اس رشتے کو "ایکو فیمینزم "ماحولیاتی تانیثیت کا نام دے دیا گیا اور یہ تانیثیت کی شاخ کے طور پہ دنیا ادب میں متعارف ہوئی۔"بریٹینیکا" میں اس کا تعارف بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

> "Ecofeminism, also called ecological feminism, branch of Feminism that examines the connections between women and Nature.Its name was coined by French feminist Francoise d'Eaubonne in 1974.Ecofeminism uses the basic feminist tenets of equality between genders,a revaluing of non-patriarchal or nonlinear structure,and a view of the world that Respects organic processes,holistic connections,and the merits of intuition and collaboration.To these notions

ecofeminism adds both a commitment to the environment and an awareness of the associations made between women and nature.Specifically, this philosophy emphasizes the ways both nature and women are treated by patriarchal (or male-centred) society.”[5]

"ایکو فیمینزم یعنی ماحولیاتی تانیثیت کی بطور ادبی تنقید ابتدا کی بات کی جائے تو اس کا آغاز فرانسیسی نقاد Frarnoise D’Eaubonne نے قریب 1974ء میں اپنی تحاریر سے کیا۔ اور اسی نے "ایکو فیمینزم" یا ماحولیاتی مادریت کی اصطلاح وضع کی"۔[۶] اس کا آغاز فطرت اور عورت پر ہونے والے پدر سری ظلم، جبر کے خلاف ایک آواز کی صورت میں ہوا۔ ماحولیاتی تباہی کی بنیادی طور پر وجہ ہی یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور دیکھا جائے تو سترھویں صدی میں آنے والے سائنس کے مشینی انقلاب نے ہمارے ماحول کو برباد کر کے رکھ دیا اور ہماری زمین کو زمین کی بجائے مشین میں بدل کے رکھ دیا جو کہ مردوں کے زیر تسلط ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواتین اور فطرت دونوں ہی جبر کی شکار ہیں اور ایکو فیمینزم ان کے آپسی رشتے پہ بحث کرتی روشنی ڈالتی نظر آتی ہے۔

جس طرح تانیثیت نے بہت ہی جلد عالمی سطح پہ خود کو منوالیا تھا ٹھیک اسی طرح ماحولیاتی تانیثیت بھی عالمی تحریک کے طور پہ ابھر کر سامنے آ گئی یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عورت اور ماحول کے حق پہ بات کرنے والے تمام لوگ ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے اور ان پہ ہونے والے جبر، ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے لگے اور ان کا اظہار ادب اور آرٹ میں کچھ زیادہ ہی شدت سے پیش ہونے لگا۔ اس تحریک کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے نسترن احسن فتیحی رقم طراز ہیں:

"Ecofeminism(ایکو فیمینزم) ایک ایسا ادبی نظریہ ہے جو حقوق نسواں کے مختلف شعبوں مثلاً تحریک امن(peace movement)،خواتین کی صحت (women’s Health Care)،ماحولیاتی تحریکات (Enviromental movement)جانوروں کی آزادی(Animal Liberation)جیسی تحریکوں سے

نمو پذیر ہوا ہے۔ماحولیات، تحریک نسواں اور سوشلزم کی بصیرت سے ماخوذ ایکو فیمینزم کے فلسفیانہ اساس کا ماننا ہے کہ وہ قوتیں جو نسل، طبقاتی فرق، صنفی یا جنسی فرق اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر استحصال کرتی ہیں وہ فطرت کے استحصال سے بھی گریز نہیں کرتیں۔"(۷)

یہاں بہت ہی واضح انداز میں بتا دیا گیا ہے۔کہ وہ قوتیں جو خواتین کے حقوق کی پاسداری نہیں کرتیں اور ان کے حق کو سلب کر کے رکھتی ہیں۔ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہمارے ماحول، فطرت کی حفاظت کریں گے۔اسی حوالے سے نسترن احسن فتیحی لکھتی ہیں:

"ایکو فیمینزم نسلی، طبقاتی، صنفی، جنسی اور جسمانی استحصال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور تمام ظلم و جبر کے خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے۔ہمارے معاشرے میں جو ظلم، استحصال اور لا قانونیت قائم ہے، کمزوروں کو بطور پائدان استعمال کر کے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کرنے والے روشن چہرے مگر اندرون چنگیز سے تاریک تر جو کردار ہیں اور خاص طور پر عورت کے ساتھ معاشرے میں جو ظلم روا رکھا جارہا ہے یا ان کو جس انداز میں اپنی آتش ہوس بجھانے کے لیے بطور کھلونا استعمال کیا جاتا ہے، ایکو فیمینزم کا فکری اساس اس کی مخالفت کرتا ہے۔حقوق نسواں کے خواب کی تعبیر اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک فطرت کو استحصالی جابر قوتوں سے آزاد نہ کرا لیا جائے۔"(۸)

ایکو فیمینزم نے بنیادی طور پہ جو نظریہ فکر پیش کیا ہے اس کے مطابق اس نظریے کے حامی قدرت کے بنائے گئے نظام میں سے جس کا استحصال کرنے کی کوشش کی جارہی ہو اس کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ اس ہونے والے استحصال میں کہیں نہ کہیں ہاتھ مرد کا ہی ہوتا ہے لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ عورت بھی مرد کی ہی طرح ایک انسان ہے مگر دیگر اشیا کی طرح وہ بھی "شے" ہی کہلاتی ہے۔اس کو مرد ذات نے انسانیت کے درجے سے ہی غائب کرنے کی پوری پوری کوشش کر دی ہے۔اس پہ بات کرتے ہوئے نسترن احسن لکھتی ہیں۔:

"ایکو فیمینزم کے سوالات لبرل فیمینزم سے مختلف ہیں کیوں کہ بنیادی طور پہ یہاں عورت کی بغاوت نہیں بلکہ کھیت اور 'کھیتوں' کی اہمیت و افادیت کو عورت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ایکو فیمینزم انسانی زندگی کی زرخیزی اور سبزہ زاری کو نامیاتی وحدت سے متشکل کرنے کی کوشش ہے۔ اس شعور کی رو کے مطابق لالچ افروز متون ثقافتی نصابوں کا حصہ بنتا رہے اور زمین اور عورت سکڑتی چلی گئیں۔"(۹)

ایکو فیمینزم کی اساس اس نظریے پہ رکھی گئی ہے کہ عورت کو انسان کی حیثیت سے دیکھا جائے نہ کہ اس کو شے سمجھ کر اس کی حیثیت جانوروں سے بھی کم تر کر دی جائے۔ ایکو فیمینزم کے مطابق عورت کا ظلم و جبر سے بچایا جائے تا کہ وہ اپنی انسانی حیثیت سے موجود پہچان کو قائم رکھتے ہوئے اپنی زندگی گزار سکے۔ ان ہی خیالات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے نسترن احسن فتیحی لکھتی ہیں:

"سر سبز و شاداب فطری حسن کی اینکر وچمنٹ اور عورت کے استحصال کے درمیان تعلق بھی تاریخی ذہن سازی کا خاصا ہے۔ یوں کہ کمزور، عورت اور نیچر کی تثلیث میں لازمیت اور ابدیت سٹیریو ٹائپ کی گئی۔ ایسے مباحث سے بلاشبہ نظر اور نظریات کی تفہیم و تعبیر کے حوالے سے نئے سوالات کو جگہ ملتی ہے۔ جنگ و جدل، وسائل پہ قبضہ کی خواہش اور چادر اور چار دیواری کے (پس) ساختیاتی مطالعہ سے نسلی، لسانی اور صنفی امتیازات تک کی پرکھ بھی آج کے تنقیدی شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ زمین زاد اور زمین زادی دونوں فطرت کا حصہ (رہے) ہیں لیکن یک طرفہ تاریخی دھارے نے مصنوعی مصنوعاتی ثقافت کے فروغ کے سبب ارتھلنگز میں تخفیفی رویے کاشت کیے ہیں۔ اس امتیازی ڈسکورس کی غیر اتفاقاتی ثقافت پہ سوالیہ نشان نئی صدی کا اہم باب ہے۔"(۱۰)

ماحولیاتی تانیثیت کی دو شاخیں ہیں۔ جو 1980 میں وجود میں آئی تھیں۔ اور یہ شاخیں radical feminism اور cultural ecofeminism کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایکو فیمینزم کا تعلق ماحولیات سے ہے تو یہ ماحولیاتی تنقید کی بھی ذیلی شاخ کہلاتی ہے۔ اس حوالے سے نسترن احسن فتیحی لکھتی ہیں:

"ایکو فیمینزم یا ماحولیاتی مادریت کی نظریاتی اور سماجی تحریک نے عورت اور مرد کو یکسانیت کے خانے میں رکھ کر ان دو مختلف جنسوں کے قدرتی اور ذاتی فرق کو واضح کیا ہے۔ ایکو فیمینزم کے اس نظریہ میں عورت اور مرد انسانی لحاظ سے برابر ہیں لیکن جسمانی اور جذباتی لحاظ سے مختلف۔ بعض معاملات میں مختلف حقوق اور مزاج کے حامل ہیں۔ ایکو فیمینزم یا ماحولیاتی مادریت کی یہ اصطلاح بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، "ایکو فیمینزم" کی یہ اصطلاح دراصل "ماحولیاتی تنقید" یعنی "ایکو کرٹسزم" کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ "[11]

ب۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی تانیثی رویے:

آمنہ مفتی اردو ادب کے قریب ہر میدان میں ایک واضح مقام بنا چکی ہیں اور اپنی قلم کی نوک سے عورتوں پہ ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتی رہی ہیں اور حتی الامکان طریقے سے اپنے ناولوں میں ماحولیاتی تنقید کے عناصر کو بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ آمنہ مفتی کے ہاں عورت اور ماحول کے مابین رشتے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب ہم اپنے گرد و پیش میں موجود ماحول اور عورت کی بات کرتے ہیں۔ تو ان میں موجود کچھ عناصر بہت ہی کمزور ہیں اور کچھ بہت زیادہ طاقتور۔ جب ہم ناول کی کہانی کو بیان کرتے ہوئے اس میں موجود ان کے کرداروں کی خصوصیات کو اجاگر کرنے لگتے ہیں تو عمومی طور پر خواتین کو ماحول یعنی فطرت کی خوب صورت مگر نازک عناصر سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ جبکہ مرد کے لیے طاقت ور عناصر سمندر، چٹانیں، طوفان، پہاڑ کی امثال کے ذریعے ان کی خصوصیات کو بیان کیا جاتا ہے۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی عناصر کے ساتھ ہی ساتھ ماحولیاتی تانیثی رویے بھی ملتے ہیں۔ جہاں عورت کی کمزور فطرت کو بیان کرنے کے لیے ہم کلی، پھول اور تتلی کا سہارا لے رہے ہیں تو مرد کی طاقت کا پرچار کرنے کے لیے بنیادی طور پہ زیادہ سے زیادہ طاقت رکھنے والے عناصر کا مماثل قرار دیا جاتا ہے۔ جب عورت کو ادب کے وسیع ترین کینوس کے ذریعے دیکھا جاتا ہے تو وہ دھرتی ماں بھی قرار پاتی ہے جو اپنے راستے میں آنے والے ہر طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ عورت کی مظلومیت ہو یا اس کی بے بسی اس کو فطرت میں پائے جانے والے مختلف استعاروں کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا منفرد کردار الگ سے نظر آتا ہے۔ وہ کمزور تو

ہے مگر اس کے اندر چٹانوں سے لڑنے کا حوصلہ بھی پایا جاتا ہے۔ عورت اور فطرت کے اس امتزاج کا ذکر ہمیں آمنہ مفتی کے ہاں بہت واضح اور منفرد انداز میں نظر آتا ہے اور ان کے تینوں ناولوں "جرات رندانہ"، "آخری زمانہ" اور "پانی مر رہا ہے" میں ہمیں ماحولیاتی تانیثی رویے باخوبی دکھتے ہیں۔ اپنے ناول "جرات رندانہ" میں لکھتی ہیں:

"اس عمر کی تو لڑکیوں کا تو کام ہی یہ ہوتا ہے کہ بے وجہ اور بے ضرورت ہنسیں اور ہنستی ہی جائیں۔ کھڑ کھڑ کھڑ۔ جیسے اکتوبر کے شیر گرم دنوں میں کپاس کے کھیت کھلتے ہیں۔ سفید سفید اجلے نرم نرم پھولوں سے لدے ہوئے نازک پودے جو اپنی ذات کے زعم میں اکڑے کھڑے ہوتے ہیں اور پھر کم رو، کم ذات چونیاں اپنے کالے، میلے، بھدے ہاتھوں اور کیچ بھرے ناخنوں سے ان پھولوں کو نوچ نوچ کر اپنی اپنی جھولیوں میں بھرتی جاتی ہیں اور پودے ٹنڈ منڈ، اداس اور شرمندہ سے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن ایک وقت اپنے بھدے، میلے ہاتھوں سے ان لڑکیوں کی ہنسی کے پھول نوچ کر اپنے جھولے میں ڈال کر چلتا بنے گا اور یہ بیچاریاں کپاس کی نازک ڈالیوں کی طرح بے رنگ ہو جائیں گی۔"(۱۲)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں عورت کی ذات کو بہت ہی خوب صورت انداز میں پیش کرتی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ بتاتی ہیں کہ کیسے اس خوب صورت، معصوم اور دل کش نظر آنے والی ہستی کو ہمارے معاشرے میں مسل کے رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ عورت کے حسن کو تو بیان کرتی ہی ہیں لیکن اس کی بے بسی اور لاچاری کو بھی منظر پر لا کے دکھاتی ہیں۔ اس کے لیے وہ مختلف پیڑ پودے، پھول، بوٹوں جیسا عورت کی ذات کو بتاتی ہے اور جس طرح معاشرے کے طاقت ور لوگ ان چیزوں کو روند ڈالتے ہیں ٹھیک اسی طرح عورت بھی ظلم کی چکی میں پستی دکھائی دیتی ہے اور اس کو زبان بندی کا حکم بھی ہے کہ جو بھی ہو جائے بول نہیں سکتی اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے۔ ایسے ہی ایک منظر کو بیان کرتے ہوئے آمنہ مفتی اپنے ناول "جرات رندانہ" میں رقم طراز ہیں:

"عظمانہ چت لیٹی فروری کے آسمان پر اڑتی چیلوں کو تاک رہی تھی۔ دور، بہت دور، خلا کی وسعتوں میں پراں، بے حس و حرکت، خاموش، پر اسرار چیلیں، ایک عجیب زندگی۔ عظمانہ نے اپنی بغلوں میں ہوا کی پھر پھراہٹ محسوس کی اور چیل ہی کی طرح

مزید پسر گئی۔ لیکن وائے حسرتا! آدم زاد کتنا اڑے، کتنا اڑے، زمین کے سینے سے چپکے رینگتے رہنا اس کا مقسوم ہے۔"(۱۳)

آمنہ مفتی اپنے ناولوں میں عورت کی بے بسی اور مظلومیت کو ماحول کے تناظر میں پیش کرنے کے لیے عورت کے پوشیدہ اسرار و رموز کو ماحولیاتی عناصر کے زیر اثر یوں سامنے لے کر آتی ہیں کہ ماحولیاتی عناصر اور عورت پہ ہونے والے ظلم کی تصویر سامنے نکل کر آجاتی ہے اور کئی جگہوں پہ تو بطور احتجاج عورت کا لہجہ بہت حد تک جارحانہ ہو جاتا ہے اور اس کا رویہ بھی باغی ہو جاتا ہے لیکن اس رویے کے پس پشت ہمارے سماج کا مرد ہے۔ جس کی وجہ سے عورت باغی ہو جاتی ہے۔ ان ہی حالات پہ بحث کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں۔:

"دیکھو صدف! مانی نے جو کچھ کیا غلط ہے لیکن تم کیا چاہتی ہو؟ مانی تم سے شادی کرے! تم سے دو سال چھوٹا لڑکا جو ابھی اپنے کیریئر میں کسی جگہ بھی نہیں کھڑا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی؟ روزاماں کی طرح گھر کا جھاڑو پونچھا کرو گی؟ آلو مولی کے پراٹھے بناؤ گی مانی کے لیے؟ دو بچے خوش حال گھرانا، تخلیق کرو گی؟ میری ماں کی طرح دھواں لگے کچن میں پرانے سٹوو پر ماش کے بھلے تلو گی اور میرے جیسی سڑیل نند کو برداشت کرو گی؟"(۱۴)

کہا جا سکتا ہے کہ عورت اپنے گرد و نواح میں موجود پدر سری معاشرہ سے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی جگہ پہ زیادتی کا شکار ضرور ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی صورت حال آمنہ مفتی کے ناول "جرات رندانہ" میں اس وقت دکھائی دیتی ہے۔ جب صدف کو عظمانہ کا بھائی مانی استعمال کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ اور خود کو اس سارے معاملے میں سے ایسے نکال لیتا ہے جیسے مکھن سے بال نکال دیا جاتا ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہونے دی جاتی ہے۔ اس طرح ہی مرد سب کچھ کر کے بھی صاف نکل جاتا ہے اور عورت ذات کچھ نہ کر کے بھی پدر سری معاشرہ کے ظلم کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی حالات پہ آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"بہار کی لطیف ہوا مزے سے برآمدے میں گھوم رہی تھی۔ سامنے لان میں خاکستری چڑیاں پھدک رہی تھیں اور جنتاں تازہ کٹی ہوئی گھاس کا گٹھڑ باندھ رہی تھی۔ اس کی بہو بھاگ گئی تھی اور بیٹا ٹی بی کا مرض لگا کر واپس آ گیا تھا۔ جنتاں اپنی دہری ہوتی کمر پر اب اس کی بیماری اور دواؤں کا بوجھ بھی اٹھا کر پھر رہی تھی۔"(۱۵)

آمنہ مفتی اپنے ناول "جرات رندانہ" میں موجود کردار "جنتاں" کے حالات زندگی کو بیان کر رہی ہیں۔ جو اپنے سماج کے عطا کردہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر کام کرنے کو نہ صرف تیار ہے بلکہ ان امور کو سرانجام بھی دے رہی ہے وہ خود کی ذات کی نفی کر کے اپنے گھر اور اس میں موجود اپنی اولاد کے لیے ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کو تیار بیٹھی ہے مگر ہمارا معاشرہ اس کو اس کی صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کی بجائے اس پہ طنز اور ظلم کرتا ہے۔ لیکن مرد کے اندر چھپے شیطان کو عورت بہت جلد محسوس کر لیتی ہے اس کے اندر قدرت نے ایسی خوبی رکھ دی ہے کہ مرد سوچتا ہے تو عورت سمجھ جاتی ہے۔ ایسے ہی حالات کو بیان کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"عظمانہ کے احساسات عجیب سے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ شیم جیسے مشہور آرٹسٹ کا اسے یوں خاص طور پر بلانا خالی از علت نہیں۔ عورتوں کے اندر ایک Scanner لگا ہوتا ہے جو ہر شخص کی اصل نیت جھٹ سے جان لیتا ہے۔ اب جانتے بوجھتے بھولا بنا تو خدا نے عورت کی فطرت میں رکھا ہے تو کیا کیا جائے۔"(۱۶)

عورت کو ہمارے معاشرے میں بہت کمزور، لاچار، بے بس اور مظلوم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کو ماحولیاتی عناصر کی کمزور ترین اشیا جیسا قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ کمزور لاچار عورت جب اپنے گھر گرہستی کو دیکھتی ہے کہ اس میں کوئی مسئلہ، کوئی پریشانی ہے یا اس کی اولاد کو اس کی ضرورت ہے تو وہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جائز ناجائز ہر کام جو ماحولیاتی تنقید کے زمرے میں آتا ہے، کر گزرتی ہے۔ وہ نازک سی عورت ہر برائی کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیتی ہے۔ ان ہی حالات کے حوالے سے مصنفہ لکھتی ہیں:

"وہ اتنی کلچرڈ عورت، میری وجہ سے یہ سب کرنے پر مجبور تھی۔ مجھے اچھی زندگی دینے کے لیے، مجھے کانونٹ میں پڑھانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھوں سے کمایا، پارٹیوں میں ناچ کے، راتوں کو گھر سے باہر رہ کے، مجھ جنم جلی کے لیے۔ میرے پاس

اس وقت پیٹنٹ لیدر کے جوتے ہوا کرتے تھے Hopsons کے جب تم سب مر مر
کے باٹا کے جوتے پہنا کرتے تھے۔"(۱۷)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں ماحولیاتی تانیثیت پہ قلم اٹھاتے ہوئے عورت کا بتاتی ہیں کہ عورت کسی بھی ماحول، معاشرے، ملک یا قوم سے تعلق رکھتی ہو جب وہ اپنی زبان اپنے مرد (باپ، بھائی، شوہر، بیٹے) کے سامنے کھولے گی ان کے عتاب کا شکار ہو گی۔ اس کی زبان بندی کروادی جائے گی اور اس پہ طرح طرح کے ظلم و ستم کر کے اسے بد چلن اور گناہ گار قرار دے دیا جائے گا۔ ایسا ہی "شہلا" کے ساتھ ہوا کہ اس کو اپنا حق استعمال کرنے پہ سزا کے طور پہ سزا کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ اس کے کردار پہ روشنی ڈالتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"اس نے آئینے میں نظر آنے والی لڑکی سے پوچھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے، روکھے بے رونق بال، پیڑیائے ہوئے ہونٹ۔ یہ شہلا تو نہیں تھی۔ ملگجا دوپٹہ جس پر عین سر کے اوپر کھونچ لگی ہوئی تھی کانوں کے پیچھے اڑسا ہوا تھا۔ ناخن ٹیڑھے میڑھے کٹے ہوئے تھے اور پیریوں کی ایڑیوں پر میل جما ہوا تھا۔"(۱۸)

آمنہ مفتی عورت پہ ہونے والے ظلم و جبر اور استحصال کو تو بیان کرتی ہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسی عورت کی قوت برداشت اور صبر پہ بھی قلم اٹھاتی ہیں جو پدر سری معاشرے کے ہاتھوں ہونے والے استحصال پہ رنجیدہ تو ہے مگر اس کو اپنی کمزوری نہیں بناتی ہے اور جہاں اس کو موقع ملتا ہے۔ وہ خود کو اس نظام سے نکالنے کے لیے پر تولتی دکھتی ہے۔ ایسے ہی ناول "جرات رندانہ" میں موجود کردار "شہلا" نے جب اڑان بھرنے کی سوچی تو دو مردوں نے اس کے پر کاٹ ڈالے وقتی طور پہ تو اس نے اس کا صدمہ لیا اور خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا مگر جیسے ہی اس کو موقع ملا تو اس نے ڈٹ کر ان حالات کا مقابلہ کیا اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم پہ آنسو بہانے کی بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس کے ان ہی حالات کو آمنہ مفتی نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے:

"میں نے تمام زندگی کسی کو اتنے ذاتی دکھ پر اتنے وقار اور خاموشی سے آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔میں نے تو گوریلا جنگوں میں مرنے والوں کی ماؤں کو بین ڈالتے دیکھا ہے یا زخموں کی تکلیف سے لوگوں کو بلبلاتے دیکھا ہے۔اور ان کیچ بھری مچاتی ہوئی آنکھوں سے بہنے والے آنسو تو تیزاب کے قطرے ہوتے ہیں، چہرے پر دارڑیں ڈالتے ہوئے آنسو۔ان کے مقابلے میں تمہارے آنسو شفاف روپہلے رخساروں سے پھسلتے ہوئے نور کے قطرے۔"(۱۹)

اپنے ناول "آخری زمانہ" میں آمنہ مفتی ایکو فیمینزم کے حوالے سے اپنے ناول کے کرداروں کی جب بات کرتی ہیں تو سب سے زیادہ جس کا استحصال ہوا ہے وہ راحیلہ کا کردار ہے۔جو پہلی نظر میں تو نہایت ہی بد تمیز اور بد اخلاق دکھائی دیتی ہے۔مگر اس کے اس رویے کے پیچھے کون سے عوامل کار فرما ہیں ان پہ کوئی بات کرنا ہی گوارا نہیں کرتا ہے۔ہر ایک کو اس سے گلہ ہے۔لیکن ایک نہایت کم عمر بچی کو جب اس کی ماں سے الگ کر دیا جائے اور اس کا باپ بھی دوسری شادی کر کے اپنی زندگی میں مگن ہے ماں بھی دوسری شادی کر چکی ہے اور وہ پھپھو اور دادا، دادی کے رحم و کرم پہ ہے۔اس کے حقوق کی پامالی کی جارہی ہے جس کی وجہ سے وہ باغی ہو چکی ہے اس کے اس رویے کو بھی کچلنے اور دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس کے اسی رویے پہ بحث کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

"یہ اچھی اپنے گلے کی مصیبت حیدر میاں نے میرے گلے ڈالی، بڑھتی آتی ہے، بڑھتی ہی چلی آتی ہے، مع جوتیوں کے آنکھوں میں گھس جاتی ہے، ذرا جو شرم لحاظ ہو اس کو۔ اب بتاؤ بھلا تجھے کیا آفت پڑی ہے میرے نکاح کے جوڑے کا رنگ ٹولنے کی؟ اپنی ماں کو دیکھو دو، دو خصم رچا کے بیٹھی ہے۔سارے راستے میری ناک میں دم کیے رکھا میں تو صبح کی پہلی بس پکڑ کے واپس جاؤں گی۔"(۲۰)

عورت ذات کس قدر استحصال کا شکار ہے اور کس حد تک وہ اپنے آس پاس موجود محبتوں سے بھی خوف زدہ ہے کہ اسے لگتا ہے کہ دنیا میں موجود پدر سری معاشرے کا ہر مرد ہی کسی نہ کسی موڑ پہ زندگی میں

ضرور اسے اپنے شر سے ڈسے گا۔بظاہر بے شک وہ اس پہ اپنی محبت لٹارہاہو لیکن جیسے ہی اس کو موقع ملے گا وہ اس کو اپنے جبر کا نشانہ ضرور بنائے گا اس لیے اسے دنیا کی ہر محبت سے مکتی چاہیئے ہے۔ماحولیاتی تانیثیت کے موضوع پہ اپنے ناول "آخری زمانہ" میں آمنہ مفتی عورت کی بے بسی اور لاچاری کو پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"راحیلہ اس محبت سے مکتی چاہتی تھی۔کیونکہ محبتیں خوف دیتی ہیں کھو دینے کا خوف، پانے کا خوف اور پانے کے بعد دنیا کا خوف، حاسدوں کا خوف، راحیلہ اس خوف سے مکتی چاہتی تھی۔ اسے محبتوں نے دکھ دیا تھا۔خوف اور لاچارگی اور بے چارگی جو راحیلہ اپنی ماں کے چلے جانے پہ محسوس کرتی تھی۔سردیوں کی راتوں میں ابی اور ممی کے درمیان سرخ مخمل کی رضائی میں آسودگی ہوتی تھی ممی کے چلے جانے کے بعد پھپھو کی رضائی میں وہ سکھ نہ تھا۔"(۲۱)

جب ہم ایکو فیمینزم کی بات کرتے ہیں تو اکثر ہمارے معاشرے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب تو مغرب کے چونچلے ہیں۔وہاں اس نظام میں عورت کو اس کا حق نہیں دیا جاتا ہے وہاں آزادی کے نام پہ اس کی عزت کو پامال کیا جاتا ہے مغربی عورت کا استحصال کیا جاتا ہے مغربی سماج کا مرد عورت پہ تشدد کرتا ہے۔ہمارے ہاں تو عورت کو بہت اعلیٰ و ارفع مقام عطا کیا جاتا ہے مگر ایسا ہوتا کچھ نہیں ہے۔ہمارے ہاں بھی عورت کے حقوق سلب کیے جاتے ہیں، وہ ستی کی جاتی ہے، ونی کی جاتی ہے جائیداد کو بچانے کے لیے اس کی قرآن سے شادی کی جاتی ہے اس کو وہ حق جو مذہب نے دے رکھا ہے وہ بھی نہیں دیا جاتا ہے اس کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے اور اگر اسی مردانہ معاشرے کے ظلم و ستم سے تنگ آکر کوئی عورت باغی ہو جائے تو اس کو تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اس پہ تیزاب بھی ڈالا جاتا ہے اس کو زندہ بھی جلایا جاتا ہے۔لیکن اس سب ظلم کے بعد بھی ہم اس کو اس طرح چھپا لیتے ہیں کہ یہ تو ہمارا بہترین خاندانی نظام ہے۔ان ہی خیالات کو لفظوں کا جامہ پہناتے ہوئے آمنہ مفتی رقم طراز ہیں:

"ہمارے ہاں سب کچھ ہوتا ہے، بس ہم مانتے نہیں ہیں۔ ہماری عورت کو وہ سب دیکھنا اور سہنا پڑتا ہے جو مغرب کی عورت سہتی ہے تنہارہ کے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم وہ سب سہتے ہیں مگر گلہ نہیں کرتے۔ اس رویے کو برا نہیں کہتے بلکہ اپنے معاشرے کی خوب صورتی اور خاندانی نظام کا نام دیتے ہیں۔"(۲۲)

آمنہ مفتی اپنے ناولوں میں ماحولیاتی تانیثیت کی کئی ایک جہتیں سامنے لا کے پیش کرتی ہیں۔ ان کے ہاں پائی جانے والی عورت صرف بے بس اور مظلومیت کا لبادہ اوڑھے ہی موجود نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں ہمیں عورت کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ پدر سری سماج جس عورت کو بے بس اور لاچار سمجھتا ہے اور جن کے خیال میں عورت کچھ نہیں کر سکتی ہے ان سب کے سامنے جب یہ ہی عورت ڈٹ جاتی ہے تو وہ زندگی میں آنے والی ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرتی دکھائی بھی دیتی ہے۔ ایسی ہی عورت کہ کہانی پہ بات کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"زندگی بھر راحیلہ نے ام کلثوم کے بارے میں کہانیاں ہی سنی تھیں۔ ام کلثوم عالمہ تھی، ام کلثوم حافظہ تھی، ام کلثوم کا میاں مجاہد تھا، ام کلثوم کا بھائی مجاہد تھا۔ ام کلثوم مدرسہ کھولنا چاہتی تھی، ام کلثوم کا باپ شہید ہو گیا، ام کلثوم کا شوہر شہید ہو گیا، ام کلثوم کا بھائی مفقود الخبر ہے۔"(۲۳)

آمنہ مفتی اپنے ناول "آخری زمانہ" میں پدر سری سماج کے بے بس اور لاچار طبقہ کا بہت گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا ہے اور وہ کہتی ہیں کہ دنیا میں موجود جتنی بھی صنف نازک سے تعلق رکھنے والی ہستیاں ہیں سب ہی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ اپنی ذات پہ ہونے والی زیادتی کا سامنا کرتی ہے اور اس میں سے زیادہ تر وہ عورتیں ہوتی ہیں جو اپنی زبان کو سی کر اپنی زندگی گزار لیتی ہیں کیونکہ ہمارا معاشرہ عورت سے اس کی یہ صلاحیت چھین لیتا ہے اور اگر کبھی بھولے سے ہی وہ اس جہان میں اڑنے کا سوچ بھی لے تو اس کے پر کاٹ دیئے جاتے ہیں اس سے رشتہ ختم کر دیا جاتا ہے اور کبھی کبھار تو جان لینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا ہے اور

اکثر رشتہ ہی ختم کر دیا جاتا ہے یہ سوچے سمجھے بنا کہ اس عورت اور اس کی اولاد کی زندگی جہنم بن جائے گی۔اس کو صرف اپنے حق میں بولنے کی سزا دے دی جاتی ہے۔ایسے ہی آمنہ مفتی نے ایکو فیمینزم کے مسائل کی نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے:

"راحیلہ کے معاملے میں قصور وار سب ہیں اور خصوصاً ثمن،کاش وہ اس وقت وہ سب نہ کرتی جو اس نے کیا۔میری بات ماننے کو اس وقت کوئی تیار نہ تھا۔شاید راحیلہ سچ ہی کہتی ہے۔میری بہن کو منافق نہ ہونے کی سزا ملی،اور کیا وہ کوئی سزا کاٹ بھی رہی ہے؟ سارہ کا رویہ کیا ٹھیک ہے؟انکل کو اس عمر میں در بدر کیا۔حاسد اور منتقم مزاج عورت،حیدر اسے بھی تو برداشت کر رہا ہے۔عالیہ کے معاملے میں وہ بھی پھولا ہوا مینڈک بن گیا تھا۔"[۲۴]

اپنے ناول "آخری زمانہ" میں آمنہ مفتی عورت کی ناکامی،لاچاری،بے بسی،مجبوری کا ماتم کرتی ہیں۔عورت جو اپنی زندگی کا زیادہ وقت گھر کے مرد کی خوشنودی اور خواہشات میں گزار دیتی ہے۔لیکن باوجود اس کے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔حتیٰ کہ اس کا اپنا بھائی بھی اپنی خوشی کے لیے اس کو اجاڑنے والے شخص سے اپنی زندگی کا ناتا جوڑ لیتا ہے۔وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جس کی طرف وہ پلٹ رہا ہے اس نے اس کی بہن کی زندگی کو دوزخ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔اس کو پرواہ ہے تو اپنی خوشی کی وہ عورت کو وہ مقام دینے کے حق میں بھی نہیں ہے جو اس کو قدرت نے عطا کر رکھا ہے اور جس کے بارے میں ماحولیاتی تانیثیت میں بھی ہے کہ عورت اور مرد انسانی لحاظ سے تو برابر ہیں مگر جسمانی اور جذباتی لحاظ سے ان میں فرق پایا جاتا ہے۔مگر ہمارے سماج میں ایسا ہرگز نہیں سمجھا جاتا ہے۔ان ہی حالات و واقعات پہ روشنی ڈالتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"اور میری ماں؟کیا آج وہ بھی وہاں آئی ہو گی؟اپنے بھائی کا چہرہ آخری بار دیکھنے؟وہ بھائی جس نے اپنی محبت کی خاطر،اپنی بہن کا ساتھ نہ دیا۔اس عورت کو معاف کر دیا جس نے اس کی بہن کا گھر اجاڑا تھا کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا ایک بنجر عورت سے

محبت کرتا تھا جو تھوہر کے زہریلے کانٹے کی طرح خوب صورت تھی۔ اتنی محبت کرنے
والے شخص کو نفرت کی بھینٹ کیوں چڑھایا گیا؟"(۲۵)

پدر سری نظام کی سوچ اور عورتوں کا کیا جانے والا استحصال ایکو فیمینزم میں بیان کیا جاتا ہے کہ عورت کے استحصال کی نشان دہی ہی نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس کے لیے اپنی آواز بھی بلند کی جاتی ہے۔ اسی پہ بات کرتے ہوئے نسترن احسن فتیحی لکھتی ہیں:

"روایتی پدر سری سوچ عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہم ایک روایتی پدر سری سوچ والے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس کی بنیاد ہی خواتین کے استحصال پر رکھی جاتی ہے۔"(۲۶)

ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں وہ ایسا معاشرہ ہے کہ جس میں ہر برائی اور گناہ صرف اور صرف عورت کی ذات سے ہی سرزد ہوتا ہے۔ وہ باپ اور بھائی کی عزت کی خاطر اپنی تمام عمر کا سودا چپ چاپ ہونے دیتی ہے۔ اکیلے ہی زندگی میں آنے والے ہر غم اور دکھ کا مقابلہ کرتے کرتے خود کو ختم کر ڈالتی ہے۔ اپنی ذات کی نفی کر دیتی ہے۔ مرد اس کو اپنا غلام بنا کر ہر خدمت اس سے کرواتا ہے اور بدلے میں مار پیٹ اور اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پانا ایک عام سی بات ہے۔ اس پر بھی بس نہیں ہوتی اسے ہر، ہر چیز کا قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اسے نصیبوں جلی کا طعنہ سننا پڑتا ہے اور ان غموں کو سہتے سہتے وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور موت کو گلے لگا لیتی ہے۔

ہمارا سماج بھی روایتی پدر سری ہے۔ یہاں بھی عورت کی اہمیت کسی بے بس اور لاچار پرندے یا پیڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ جس طرح مرد ذات زمین میں اگی ہوئی گھاس کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہے اور اس کو اپنے پیروں کے نیچے کچل کے رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح عورت کی ذات کا فیصلہ بھی باپ بھائی کرنے سے پہلے یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھی جیتی جاگتی سانس لیتی انسان ہیں ان کے بھی کچھ ارمان ہیں یہ بھی اپنی آنکھوں میں کوئی خواب رکھتی ہیں۔ بلکہ جہاں ان کو اپنا مفاد نظر آتا ہے اسی رخ میں ان کی زندگی کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" میں جب شاماں کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ اس کے باپ نے اپنے

اصولوں کے حساب سے کرنا چاہا تو وہ باغی ہو گئی اور اپنی زندگی کا یہ فیصلہ خود لے لیا اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> "شکل و صورت کی تو خیر ایسی کوئی بات نہیں، شاماں کو خدا نے جرات اور ذہانت، جی بھر کے دی تھی۔ جب برادری میں اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہ ملنے کی وجہ سے ابے نے فیصلہ کیا کہ شاماں کو کنوار کوٹھا آباد کرنا ہے تو اس نے اپنی زندگی کا راستہ خود ہی چن لیا۔"[۲۷]

عورت خواہ کسی بھی علاقے، ملک، قوم، سماج سے منسلک ہو اگر وہ اپنے باپ، بھائی شوہر، بیٹے کے اونچے شملے کے رعب میں نہ آئے تو اس کو اس کے اس گناہ کی سزا ساری عمر بھگتنی پڑتی ہے کیونکہ مرد کی ذہنیت ہی ایسی ہے کہ اسے اپنے سامنے راتی گڑ گڑاتی اور ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے بھی اپنے سامنے ہاتھ پھیلاتی عورت چاہیے ہوتی ہے اور جو عورت ایسا نہ کرے اپنے ماحول میں پائی جانے والی تتلی، چڑیا یا پودوں کی مانند وہ بھی کچل دی جاتی ہے۔ ایسے ہی جب شاماں کی شادی جنت بی بی نے میاں اللہ یار کی بجائے مینے سے کروا دی تو اس نے بدلے کے لیے شاماں سے بھی کم عمر فضل بی بی سے شادی کر لی۔ ان ہی حالات پہ بحث کرتے ہوئے آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

> "پھر انہوں نے جنت بی بی سے بدلہ لیا اور ایک سولہ سالہ خوب صورت لڑکی سے شادی کر لی جو شاماں سے کہیں زیادہ حسین کہ میاں اللہ یار خود بھی اسے دیکھ کر بس گھگھیا کر رہ گئے۔ لیکن بات یہ تھی کہ شاماں کے فرار نے اس کے وجود میں جو دل کشی اور اسرار پیدا کیا تھا وہ فضل بی بی کے معصوم حسن اور نو عمر سے کہیں بھاری تھا۔"[۲۸]

آمنہ مفتی ماحولیاتی عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے عورت کی فطرت میں پنہاں رازوں سے ایسے پردہ اٹھاتی ہیں کہ دونوں کی استحصال یافتہ تصویر کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ کیسے ان پہ جبر کیا گیا اور اس کے نتیجے کے طور پہ اس کو لہجہ جارحانہ اور رویہ باغیانہ ہو جاتا ہے اور دیکھا جائے تو ان کے اس رویے کے پیچھے مرد ذات ہی موجود ہے آمنہ مفتی کے ہاں ان کے ناولوں میں کمزور، لاچار اور بے بس عورت موجود ہے۔ جس پہ ہاتھ

اٹھانا مرد اپنا حق سمجھتا ہے اسے لگتا ہے کہ حق مہر کے عوض یہ عورت اس کی غلام بن گئی ہے اور وہ اب اس کا حاکم ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ ایسے ہی جب میاں اللہ یار جنت بی بی پہ سوت لے آئے تو لاڈوں پلی جنت بی بی کے اوپر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان ہی کیفیات کو آمنہ مفتی نے اپنے قلم کی نوک سے یوں بیان کیا ہے:

> "اس رات جنت بی بی نے فضل بی بی کو بد دعا دی، اسرار کو کوسا اور میاں اللہ یار کو توم کے رکھ دیا۔ کسی میں جرات نہ تھی کہ وہ اس بپھری ہوئی شیرنی کے سامنے آتا۔ میاں سلطان محمود کی اکلوتی بیٹی جس کے جہیز میں سوپلنگ پیڑھا تھا اور برات پہ جانے والے سب لوگوں کو اصلی ریشم کی نو نو گز کی پگڑیاں دی گئی تھیں۔ اس جنت بی بی کو جس نے کبھی سادہ پانی نہیں پیا تھا، جو کیوڑے میں بسے گھڑے کا پانی پیتی تھی۔ اس لاڈوں پالی پہ میاں اللہ یار نے سوت لا کے بٹھا دی تھی۔ دکھ ساد کھ؟[۲۹]

ہمارے معاشرے کا مرد خود خواہ کتنا ہی زیادہ گناہ گار کیوں نہ ہو وہ اپنے گھر کی عورت کو کبھی اس حد تک آزادی نہیں دیتا ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلے اپنی مرضی سے کر سکے اور اپنی زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق گزار سکے۔ ایسے ہی غفور خود تو نہ صرف ناجائز رشتہ بنائے ہوئے تھا بلکہ اس کی وجہ سے اس کے عتاب کا شکار ماحول کے درخت ہو رہے تھے جن کو اپنے تعلقات کی بناء پہ وہ بے دریغ کاٹ ڈالتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس سے وہ ماحول کے عناصر کو اپنے پاؤں تلے روند رہا ہے۔ اس کے حوالے سے بات کرتے ہوئے آمنہ مفتی رقم طراز ہیں:

> "غفور آرے والا، کوئی ایسا شریف آدمی نہ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ پڑوس کے گاؤں کی ایک عورت سلمیٰ سے اس کے ناجائز تعلقات تھے اور وہ عورت کسی فاریسٹ آفیسر کے ساتھ بھی خراب تھی۔ غفور سرکاری ذخیرے سے اپنی پسند کے درخت چھانٹ کے غائب کر دیا کرتا تھا اور وہ فاریسٹ آفیسر اپنی معشوقہ کی سفارش پہ یہ جرم دبا جاتا تھا۔[۳۰]

مرد خود تو اپنے سماج میں ایک آزاد پنچھی کی حیثیت سے آزادی سے ہر طرف محو پرواز رہتا ہے جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے۔ جتنے رشتے تعلق واسطے اس کو بنانے نبھانے ہوتے ہیں ان کو بنائے رکھتا ہے۔ مگر اپنے ہی مقابلے میں عورت ہو یا زمین دونوں میں سے کسی کو بھی آزاد رہنے یا اپنے اصول وضع کر کے زندگی گزارنے کا کبھی کوئی حق نہیں دیا جاتا ہے مرد اپنے گھر کی عورت کے علاوہ معاشرے کی دیگر خواتین کے ساتھ

بھی اپنا کوئی نہ کوئی سمبندھ بنا کے رکھتا ہے۔اسی پہ بات کرتے ہوئے آمنہ مفتی اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں لکھتی ہیں:

"دیکھ لڑکی !مرد دریا ہوتا ہے،زندگی بانٹتا ہے،اس کے کناروں پہ بستیاں بستی ہیں۔لیکن یہ بھی سن لے،دریا کو بانٹ نہیں سکتے۔دریا جہاں بہتا ہے وہیں کا ہوتا ہے، اور تیرا شوہر تیرا ہے اسے اپنا رکھ۔ان سب میں بانٹ دے گی تو کیا خود پیاسی رہے گی"۔[۳۱]

ہمارا پاکستانی معاشرہ وہ معاشرہ ہے جہاں مرد کو جو مقام اور رتبہ حاصل ہے وہ عورت کو بھی انسان ہونے کے ناتے بھی نہیں مل پاتا ہے بلکہ اس کو بھی ماحول میں پائی جانے والی دیگر اشیاء کی طرح "شے "ہی سمجھا جاتا ہے۔اس کی سب سے بڑی صفت اس کی زبان بندی کو خیال کیا جاتا ہے۔وہ زبان پہ تالا لگا کر مرد کے کیے تمام فیصلوں کو بغیر پس و پیش قبول کر لے کوئی مزاحمت نہ کرے اپنا کوئی حق استعمال نہ کرے اور اگر کبھی اس کے سامنے کوئی سر اٹھالے تو وہ ساری زندگی اس بات کو نہیں بھولتا ہے اور جب جب اس کو موقعہ ملتا ہے وہ اپنے اس معاملے کو بار بار پیش کرتا ہے نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ اس پہ گالم گلوچ اور لعن طعن کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہے۔اس سب سے بھی اگر سکون نہ ملے تو مار پیٹ سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ناول "پانی مر رہا ہے" میں آمنہ مفتی میاں اللہ یار کی شاماں سے شادی نہ ہونے کی لگی پھانس جو اس کے دل میں کہیں ابھی بھی اٹکی ہوئی ہے روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں:

"دنداسے سے رنگے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھوں میں چھلکتا کاجل،شاماں آج بھی ویسی تھی کہ میاں اللہ یار اگر بھولے سے ایک نظر ڈال بیٹھتے تو گھنٹوں مینے کو کوستے،"گھنا، ماں کا یار"اور پھر بھی دل نہ بھرتا تو جنت بی بی کو اتنی گندی گالیاں دیتے کہ آخر کار خود ہی شرما جاتے۔"[۳۲]

آمنہ مفتی اپنے ناولوں میں کمزور سی عورت اور بہت زیادہ رعب اور طاقت ور مرد دونوں کے حالات اور مسائل کا ذکر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔وہ عورت کی ذات کو محکوم اور محروم رکھنے کے خلاف اپنی آواز اٹھاتی ہیں۔وہ چاہتی ہیں کہ جیسے ہمارے سماج میں مرد کو عزت،وقار،نام،مرتبہ دیا جاتا ہے۔ایسے ہی عورت کو بھی اللہ نے جو انعام دے رکھا ہے جو مقام و مرتبہ عطا کر رکھا ہے معاشرہ بھی اس کو وہ دے اس کو اس کا حق دیا

جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کو زندہ انسانوں کی طرح گزار سکے وہ پل، پل گھٹ، گھٹ کے نہ جیے بلکہ اس کی زندگی بھی اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہ ہو۔ اس کے دل میں بھی معاشرے کے کسی نفس کے لیے نفرت نہ ہو وہ ہر رشتے کو خوش دلی اور خوش اسلوبی سے نبھائے۔ رشتوں کے اسی گورکھ دھندے کو آمنہ مفتی ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

"وہ بھیانک خواب اس کے سامنے موجود رہتا۔ اس بچے کے لیے اس کے دل میں بیک وقت نفرت، خوف، رحم اور محبت کے جذبات موجزن رہتے۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہتا کہ قریب گری درخت کی موٹی سی شاخ اٹھا کے اس کے ننھے سے سر پہ اتنے زور سے مارے، جتنے زور سے اس نے ایک بار اپنے مرحوم شوہر کی بیاس میں سے پکڑی ہوئی مچھلی کے سر پہ ماری تھی۔ مچھلی زور سے تڑپی تھی اور ساکت ہو گئی تھی۔"[۳۳]

آمنہ مفتی کے تینوں ناولوں "جرات رندانہ"، "آخری زمانہ" اور "پانی مر رہا ہے" میں ایکو فیمینزم کی مختلف صورتیں اور رویے دکھائی دیئے کہ کیسے کیسے انسان (مرد) نے عورت اور زمین کو شے تصور کرتے ہوئے اس پر اپنا تسلط قائم کر کے اس پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے ہیں۔ اس کے احساسات و جذبات کو کب، کب اور کہاں، کہاں بلکہ کیسے، کیسے روندا گیا ہے۔ اس کی ذات کی نفی کی گئی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کائنات میں عورت کے بنا مرد کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے پھر بھی اس کو ہر جگہ تذلیل کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے بلکہ اب دن بدن جیسے جیسے شعور آتا جا رہا ہے اس (مرد) کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو رہا ہے اور وہ (مرد) عورت کو بھی شے سے انسان سمجھنے کی کوشش میں ہے۔

حوالہ جات

۱۔ https://www.britannica.com/topic/feminism/ 14 March 2021

۲۔ محمد اشرف، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

۳۔ شہناز نبی، ڈاکٹر، فیمینزم - تاریخ و تنقید، رہروان ادب پبلی کیشنز، کولکتہ۔ ص ۱۷۔

۴۔ انیس ہارون، "فیمینزم اور پاکستانی زیورات" مشمولہ فیمینزم اور ہم - ادب کی گواہی، ادارت فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، جون 2005، ص 12۔

5۔ https://www.britannica.com/topic/feminism/14 March 2021

۶۔ نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، عفیف پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷

۷۔ ایضاً۔ ص ۱۷۔۱۸

۸۔ ایضاً، ص ۱۱

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۔۱۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۱۱۔ آمنہ مفتی، جرات رندانہ، الفیصل پبلیشرز، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۔۱۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۷۔ ایضاً۔ ص ۱۶۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۹۔ آمنہ مفتی، آخری زمانہ، الفیصل پبلشرز، لاہور، پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص ۷۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۲۱۔ ایضاً، ص۴۱۸

۲۲۔ ایضاً، ص۵۰۴

۲۳۔ ایضاً، ص۵۱۶

۲۴۔ ایضاً، ص۵۴۰

۲۵۔ نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بھارت، ۲۰۱۶ء، ص۱۸

۲۶۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفیصل پبلشرز، لاہور، پاکستان، ص۸

۲۷۔ ایضاً، ص۹

۲۸۔ ایضاً، ص۲۹۔۳۰

۲۹۔ ایضاً، ص۴۰

۳۰۔ ایضاً، ص۵۶

۳۱۔ ایضاً، ص۱۰۹

۳۲۔ ایضاً، ص۱۳۴

۳۳۔ ایضاً، ص۱۴۶

باب پنجم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ:

عمومی طور پہ کہا جاتا ہے کہ ادب میں ہونے والی تخلیقات ہوں یا فنون لطیفہ میں فنکاروں کے ہاتھوں بنائے جانے والے خوب صورت اور دل کش فن پارے، ان کے پس پشت کئی طرح کے عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ ان عوامل یا محرکات میں سے دو اہم ترین کسی بھی ادیب یا تخلیق کار کے خارجی اور داخلی عوامل کہلاتے ہیں۔ یعنی عام الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ادیب یا تخلیق کار کا اپنے سماج اور ماحول سے کیا تعلق / واسطہ ہے اور یہ رشتہ کس حد تک اس کی ترقی یا تنزلی میں کردار ادا کر رہا ہے۔ دوسرا کسی بھی فرد کے ذاتی خیالات اور افکار ہیں جو اسے معاشرے میں پائے جانے والے دیگر لوگوں سے جدا کرتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ہمارے ادیبوں اور فنکاروں کا کام ایک دوسرے سے الگ، الگ ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں عوامل کے حسین امتزاج سے ہمارے ہاں خوب صورت ادب اور فن پارے تخلیق ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

اب اگر ہم ادب میں پائے جانے والے نظریات کی بات کریں تو ادب کی تخلیق کے دوران اب تک کئی نظریات پیش ہو چکے ہیں اور مغرب کے ساتھ مشرق نے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق نہ صرف ان نظریات کے زیر اثر اپنے ادب پارے تخلیق کیے بلکہ ان پہ مزید غور و فکر کرتے ہوئے ان میں نکھار پیدا کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں جو تا حال جاری ہیں اور رہیں گی۔

ماحولیات کی روایت اردو ناول میں دور اولین سے موجود ہے۔ لیکن باقاعدہ طور پہ ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے کافی بعد میں یعنی بیسویں صدی کے اواخر میں لکھا جانے لگا۔ پہلے پہل تو ماحولیات کا تذکرہ تمام ناول نگاروں کے ہاں ان سب کے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق پیش کیا جاتا تھا۔ کیونکہ انسان، ادب اور ماحول کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اس تحقیق کی ابتدائی بحث میں ماحولیات کے مختلف لغات اور اصطلاحات کی کتب میں پائے جانے والے اس کے معنی و مفہوم کو بیان کرنے کے ساتھ اس کی مختلف تعریفات کو باب اوّل کا حصہ بنایا کیا گیا ہے۔ ماحولیات کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کا نقطہ نظر بھی شامل کیا گیا ہے۔ ادب میں ماحولیاتی تنقید کا آغاز کس نے اور کب کیا اور کن دبستانوں سے ہوتا ہوا یہ اردو ادب میں شامل حال ہوا۔ اردو ادب کے اولین کون سے فکشن نگار، شاعر یا تنقید نگار تھے جن کے ہاں ہمیں ماحولیاتی تنقید کے آثار نظر آتے ہیں اور اردو

ناول،ڈراما،افسانہ، تنقید، فلم اور شاعری میں ماحولیاتی تنقید کے زیر اثر لکھنے والے کون کون لوگ ہیں پھر باقاعدہ طور پہ اس تنقیدی دبستان کے زیر کون کون سا ادب تخلیق ہوا اس سب کا احوال باب اوّل میں موجود ہے۔

اردو ادب کی صنف ناول نگاری میں آمنہ مفتی ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔انہوں نے بہت ہی کم وقت میں ادبی حلقوں میں اپنا ایک واضح مقام بنالیا ہے۔اردو ادب میں ان کا نام بطور ڈراما نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، کالم نگار اور استاد کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔اس مقالے میں ان کے ناولوں میں موجود ماحولیاتی عناصر کی صورت حال اور اس کے کم و کیف کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کی زندگی کے کوائف مختصراً باب اول میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔ جس میں ان کے تخلیقی و تنقیدی ادب پاروں کی فہرست بھی مرتب کر دی گئی ہے۔

چونکہ اس تحقیقی مقالے کا مقصد آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ ہے۔اس لیے بنیادی مباحث کے بعد باب دوم میں ان کے دو ناولوں "جرات رندانہ" اور "آخری زمانہ" کا ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔

باب دوم کے پہلے حصے میں آمنہ مفتی کے پہلے ناول "جرات رندانہ" کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد اس ناول میں آمنہ مفتی نے ماحولیاتی تنقید کے عناصر دریا، ہوا، پانی، بادل، برسات، جنگلی حیات، جانور، ندیاں، نالے، پرندے، کھیت کھلیان اور وہ تمام ماحولیاتی عناصر جن سے انسان کا واسطہ روز اوّل سے جڑ گیا تھا اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا ان سب کا ذکر ہمیں شد و مد سے ملتا ہے۔وہ ہمارے گرد و پیش میں موجود ماحولیاتی عناصر کی خوب صورتی اور دل کشی کو بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے ساتھ انسان کے اپنے ہاتھوں سے ہونے والے ماحولیاتی نقصان پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔وہ ماحول اور انسان کے رشتے کو ادب سے منسلک کرتے ہوئے اس کا بہت باریکی سے نہ صرف جائزہ لیتی ہیں بلکہ انسان کے ہاتھوں ہونے والے ماحولیاتی مسائل کا ذکر بھی اپنے ناول میں کرتی ہیں۔ان حالات کو جانچتی، پرکھتی اور پھر قارئین کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ان کے مطابق ہمیں اپنے ماحول میں دن بدن بڑھتے ہوئے مسائل کا موازنہ گزشتہ ادوار سے کر کے اپنے آج اور آنے

والے کل کو بہتر بنانے کے لیے ان پہ قابو پانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی، تیزی سے کاٹے جانے والے درختوں، فیکٹریوں اور کارخانوں سے نکلنے والے فضلے اور اسی طرح کے دیگر مسائل پہ بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیئے تاکہ ہمارے ماحول کے وہ عناصر جو ایک خوابی کیفیت تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں وہ حقیقت کا روپ دھار سکیں اور ہمارا ماحول پہلے کی طرح نہ صرف انسان دوست بلکہ اس دنیا میں پائی جانے والی تمام حیات کے لیے سازگار ہو جائے۔

باب دوم کے دوسرے حصے میں آمنہ مفتی کے دوسرے ناول "آخری زمانہ" کا تعارف بیان کیا گیا ہے۔ ناول کے تعارف کے بعد ناول میں موجود ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کو بیان کیا گیا ہے۔ آمنہ مفتی کے اس ناول کی ابتدا میں ہمیں گاؤں کے خوب صورت اور حسین نظاروں کے ذریعے ماحولیاتی عناصر سامنے آتے ہیں اور پھر جیسے جیسے ناول کی کہانی چلتی ہے تو ٹھیک جیسے حضرت انسان نے اپنے ہوس اور لالچ کی بھینٹ اس ماحول کو چڑھایا ہے اس کا تذکرہ ہونے لگتا ہے کہ کیسے ہم دنیا پہ اپنی حکمرانی اور جھوٹی شان و شوکت کو قائم کرنے کے لیے فطرت کے حسین نظاروں کو تہس نہس کر کے اپنے خود کے لیے ہی مسائل کا انبار لگاتے جا رہے ہیں۔ ناول کے پس پردہ افغانستان اور امریکہ کے مابین ہونے والی جنگ اور اس کے ہولناک اثرات نے کیسے ہمارے ماحولیاتی عناصر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے کو بیان کیا گیا ہے۔ جنگ میں استعمال ہونے والے بم دھماکوں نے فضا میں موجود ہر چیز کو متاثر کیا۔ وہ زمین جو کبھی امن و سکون اور آتشی کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ اب حضرت انسان کی اپنی ہوس اور لالچ کی زد میں آچکی ہے۔ اس زمین پہ پائے جانے والے پرندے بھی اس ماحول کی وجہ سے اب کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے رہنے کے ٹھکانے انسان کے ہاتھوں دن بدن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی بنیادی وجہ انسان کا لالچ اور بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ جن کی پیش نظر درختوں کا کٹاؤ بے دریغ جاری ہے اور جس طرح انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے گھر کی اور ماحول کی ضرورت ہے اس طرح ہمارے پرندوں کو بھی اپنی زندگی گزارنے کے لیے بنیادی ضروریات گھر، خوراک، ماحولیاتی عناصر چاہیئے۔ ان کو اگر یہ سب میسر نہیں ہو گا تو ان کی نسلیں بھی کچھ تو ختم ہو گئی ہیں اور جو رہ گئی ہیں ایسے ہی حالات رہے تو وہ بھی ناپید ہو جائیں گی اور پھر ان ختم ہو جانے والی حیات کے بارے میں ہم

اپنے ادب پاروں اور تاریخ کی کتب میں ہی پڑھتے پائے جائیں گے۔ان کو زندہ سلامت اپنی حقیقی آنکھ سے کبھی نہیں دیکھ سکے گے۔اس کی مثال ایک کالے ہرن کی سی ہے۔

مقالے کے باب سوم میں آمنہ مفتی کے تیسرے ناول "پانی مر رہاہے" میں موجود ماحولیاتی عناصر کا مطالعہ کیا گیاہے۔باب کے آغاز میں ناول "پانی مر رہاہے" کا تعارف پیش کیا گیاہے اور ناول کی کہانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے کرداروں اور نظاروں پہ بات کی گئی ہے۔

اس کے بعد ناول میں موجود ماحولیاتی عناصر کا برتاؤ کس حد تک اور کتنا کیا گیاہے اس پہ بحث کی گئی ہے۔اس ناول میں ہمارے مرتے ہوئے دریاؤں اور ان دریاؤں میں موجود آبی مخلوقات اور ان دریاؤں کی گزر گاہوں میں اگنے والے درخت، پیڑ، پودوں کی بات کی گئی ہے کہ کیسے انسان نے اپنے نفع کے لیے دریاؤں کے پانی پہ سودے بازی کی اور جب ایک دریا کے پانی پہ بند باندھ کر اس کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جائے یا اس پہ ڈیم اور رابطہ نہروں کی کھدائی کروائی جائے تو اس کے پس منظر میں ہمارے ماحولیاتی نظام میں کس قدر بدلاؤ آتاہے اور اس بدلاؤ کے حضرت انسان اور دیگر جان داروں پہ کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا تذکرہ اس ناول میں مصنفہ نے بہت واضح انداز میں پیش کر دیاہے۔

جب ہم مختلف ڈیم بناتے ہیں تو ہم انسانوں کے رہن سہن کے لیے اسے تو دوسری جگہ منتقل کرنے کے اسباب پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر اس زمین پہ بسنے والے دیگر جان داروں کو سرے سے بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پہ یہ تمام جان دار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔قدرت نے اس نظام زندگی میں کسی کو بھی بنا مطلب کے نہیں پیدا کیاہے ہر شے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ لیکن انسان اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے جب قدرت کی عطا کردہ ان نعمتوں کا ضیاع کرتاہے تو قدرت کی طرف سے پھر اس کے نظام میں دخل دینے کی سزا بھی بھگتتاہے۔

انسان نے جب خود اپنے ہاتھوں سے اپنے دریاؤں کے پانی کا سودا کر لیا تو اس پر ہی بس نہیں کی۔بلکہ اس نے ان خشک ہو جانے والے دریاؤں کی گزر گاہوں کو زیر کاشت لانے کے لیے بھی تگ و دو شروع کر دی۔وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس ریتلی زمین میں رہنے والی مخلوق جس کے لیے اس کا یہ ہی ماحول ساز گار ہے جب یہ نہیں رہے گا تو ان کی حیات کو خطرہ لاحق ہو جائے گا وہ خاتمے کی طرف چلی جائے گی۔ مگر انسان کو تو

بس اپنے مفاد کی پرواہ ہے وہ صرف اپنی ذات کا ہی سوچتا ہے۔اسی سوچ کے زیر اثر جب اس نے قدرت کے نظام میں مداخلت کی تو قدرت نے سزا کے طور پہ اس پہ کئی طرح کے عذاب نازل کیے۔جن میں زمین کا پھٹنا، جانوروں کی عجیب و غریب حرکات، زمین پہ زلزلوں کا آنا، آسمان سے مچھلیوں کی بارش وغیرہ۔یہ ہی نہیں قدرت نے انسان کو سبق سیکھانے کے لیے ان کی اولادوں میں ایسے بچوں کی پیدائش بھی ہوتی ہے جن کے آدھے دھڑ انسانی اور آدھے مچھلی کے تھے۔مگر انسان نے پھر بھی اس سے سبق حاصل نہیں کیا اور اب تک وہ ماحول اور فطرت کے اندر اپنے مفاد کے لیے روڑے اٹکاتا آرہا ہے اور اس کی اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اپنے خود کے بڑے بڑے نقصانات بھی کرتا جارہا ہے۔مگر اس کے اندر کی حرص کسی بھی صورت پوری نہیں ہو رہی ہے۔

تحقیقی مقالے کے باب چہارم میں آمنہ مفتی کے ناولوں کا ماحولیاتی تانیثی مطالعہ کیا گیا ہے۔اس باب کے پہلے حصے میں ماحولیاتی تنقید اور تانیثیت کے آپسی رشتے پہ بات کی گئی ہے۔ماحولیاتی مادریت یا ماحولیاتی تانیثیت ایک طرف اگر تانیثیت کی شاخ ہے تو دوسری طرف وہ ماحولیاتی تنقید کی بھی ایک ذیلی شاخ ہے۔جس میں عورت اور فطرت کے مابین جو تعلق ہے اسے ادب میں کیسے اور کس حد تک پیش کیا جارہا ہے۔اس پر بات کی گئی ہے۔اس باب میں سب سے پہلے تانیثیت کے محرکات اس کے آغاز اور اس کے ابتدا کس نے اور کب کی اس کی مختلف ادباء وناقدین نے کیا تعریفیں کی ہیں اس پر بات کی گئی اس کے بعد تانیثیت کی شاخیں کتنی ہیں اور اس میں ماحولیاتی تانیثیت یا ماحولیاتی مادریت کی کیا اہمیت ہے۔اس کا آغاز کب اور کس سال میں اور کہاں کے رہنے والے نے کیا اس پر بھی بحث کی گئی ہے اور پھر اس کا ماحولیاتی تنقید سے کیسا رشتہ ہے اور یہ ماحولیاتی تنقید کی ایک ذیلی شاخ کیونکر ہے اس سب پہ بحث و مباحثہ باب چہارم کے ابتدائی حصے میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔

باب چہارم کے دوسرے حصے میں آمنہ مفتی کے ناولوں میں جو ماحولیاتی تانیثی رویے پائے گئے ہیں ان پہ بات کی گئی ہے کہ ان رویوں کے پیچھے کون سے عوامل کار فرما تھے اور کیوں عورت کی ذات کو اس حد تک بے بس، لاچار، کمزور بنا دیا گیا ہے۔ہمارے پدرسری نظام نے عورت کو ایک انسان ہونے کے باوجود انسانیت کے رتبے سے گرا کر ایک شے کی حیثیت دے رکھی ہے۔جس طرح ہم قانون فطرت میں دخل دے دے کر

اس کو بگاڑ چکے ہیں ٹھیک اسی طرح ہم نے عورت کو بھی ماحول میں پائی جانے والی گھاس، چڑیا، تتلی سمجھ لیا ہے جو بے حد نازک ہے اور قدرت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ مرد جب، جہاں اس کا دل چاہے اس کو بے عزت کر کے اس کی مار کٹائی بھی کر سکتا ہے اور ان مردوں کو لگتا ہے کہ حق مہر کے عوض ان کو عورت پہ تشدد کرنے کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ عورت کے لیے ہر حال میں زبان بندی کا حکم ہے۔ اگر اس نے بھولے سے بھی باغیانہ رویہ اپنا لیا حالانکہ اس کی وجہ بھی ہمارا پدر سری سماج ہے پھر بھی اس کی زبان پہ تالے لگا دیے جاتے ہیں لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو تتلی کے پروں کی طرح اس کے پر بھی مسل دیے جاتے ہیں پھر بھی اگر وہ پھڑ پھڑاتی ہے تو اس کی گردن چڑیا کی گردن کی طرح مروڑ دی جاتی ہے۔ عموماً ہمارے ہاں خواتین پہ طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں ان پہ جبر و تشدد کیا جاتا ہے، مگر ان تحریکات کی وجہ سے اب کافی حد تک بدلاؤ لانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کا ذکر ہمیں آمنہ مفتی کے ہاں نظر آتا ہے۔ وہ جہاں ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں کہ ہمارے ہاں عورت کو بالکل زمین، فطرت، ماحول کی طرح بگاڑنے پہ پدر سری سماج اڑ گیا ہے تو وہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو عورت کی فلاح و بہبود کے لیے بھی آواز اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے دیہی علاقوں میں آج بھی عورت ایک جیتی جاگتی انسان نہیں ہے بلکہ اس کو عام اشیاء کی طرح ایک معمولی اور بے ضرر سی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ جس کی نہ تو کوئی خواہش ہے اور نہ ہی اس کے اندر ہمارے پدر سری معاشرے کے مردوں کی مانند دل ہے۔ جس طرح یہ مرد کسی بھی جانور یا زمین کے مالک بن کے ان کی تقدیر کے فیصلے کر لیتے ہیں ٹھیک اسی طرح وہ اس عورت کو بھی اپنے کیے گئے ہر فیصلے پہ جھکنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں اور عورت بھی زمین کی طرح خود کے ضیاع کو خود کے حقوق کے ضیاع کو اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے دیکھتی آ رہی ہے۔ ایسا نہ جانے کب تک ہوتا رہے اور نہ جانے کب تک ہمارا یہ معاشرہ اس کو اس کا جائز مقام دے پانے میں کامیاب ہو پاتا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

آمنہ مفتی کے ناولوں میں ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ کے تحت اس تحقیق کے لیے جو سوالات مرتب کیے گئے تھے ان کی روشنی میں جو بھی نتائج سامنے آتے ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں۔

۱۔ آمنہ مفتی منفرد اور اچھوتے موضوعات کا چناؤ کرتی ہیں جس کی جھلک ان کے ناولوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ان کے ناولوں میں ہمیں ماحولیاتی تنقید کا موضوع ملتا ہے۔جس کو باقاعدہ طور پہ موضوع بنانے کی روایات بہت کم،کم ہیں اورخاص طور پر اردو ادب میں اس موضوع پہ باقاعدہ طور پہ لکھنے والے خال خال ہی سامنے آتے ہیں۔

۲۔ ماحولیاتی تنقیدادبی متن میں ماحول کی پیش کش کا مطالعہ کرتی ہے۔ماحولیاتی تنقید فطرت اور ثقافت کے درمیان رابطے بلکہ خاص طور پہ ادب اور زبان کے ثقافتی اوضاع کو موضوع بناتی ہے اور سادہ ترین الفاظ میں ماحولیاتی تنقید ادب اور ماحول کے رشتے کے مطالعہ کا نام ہے۔

۳۔ آمنہ مفتی کے تینوں ناولوں"جرات رندانہ"،آخری زمانہ" اور " پانی مر رہا ہے" میں ماحولیاتی تنقیدی عناصرکو مساوی مقام دیتے ہوئے ماحولیاتی سماجی اقدار کو وضع کیا گیا ہے۔ان کے ناولوں میں مختلف ماحولیاتی تنقیدی عناصر بشر مرکزیت،بن نگاری،راعیانیت،منظر نگاری،حیات مرکزیت سے ایک مکمل ماحولیاتی فلسفہ بنا گیا ہے جو ایک مکمل ماحولیاتی نظام بنادیتا ہے۔

۴۔ آمنہ مفتی نے ماحولیاتی تنقیدی عنا صر کو پیش کرتے ہوئے حیات مرکزیت کی پیش کش میں تمام مظاہر فطرت کو انصاف کے ساتھ بیان کرتے ہوئےمقامی ماحولیاتی کرے کی موجودہ تصویر کشی ، اقدار اور رویوں کو واضح کیا ہے جو مرکز حیات کی بنیاد ہیں۔بن نگاری کے حوالے سے ان کے ناولوں میں مقامی ماحولیات کی پیشکش اس انداز سے کی گئی ہے کہ نہ تو وہ اپنی آب وہوا اور زمین سے کٹے ہیں نہ تخیلاتی ہیں بلکہ ان کے ذاتی مشاہدے ہیں جو بحیثیت فرد مناظر اور ماحولیاتی مسائل کے حوالے سے ان کا احساسات ہیں۔عموما ادیب ہو یا نقادماحولیاتی حوالے سے دیگر مخلوقات کو بھی انسان کی طرح جذبات و احساسات،خواہشات اور شعور کا حامل سمجھتے ہیں۔آمنہ مفتی نے اپنے ناولوں میں جو منظر نگاری کی ہے اس میں

انسان اور فطرت کا تعلق کسی جگہ تو بہت ہی گہرا اور کہیں نہ ہونے کے برابر ہے۔ تشکیلی علاحدگی میں ڈیکارٹ کے نظریے کے مطابق جانوروں کے کوئی احساسات و جذبات ہے ہی نہیں مگر آمنہ مفتی نے اس کی نفی کرتے ہوئے حیوانات کے احساسات و جذبات کو کامیابی سے اجاگر کیا ہے۔

۵۔ ایکو فیمینزم ماحولیاتی تنقید کی ایک ذیلی شاخ ہے۔اس نظریہ کے مطابق عورت اور مرد انسانی لحاظ سے برابر ہیں مگر جسمانی و جذباتی لحاظ سے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں ۔یہ ایک ایسا ادبی نظریہ ہے۔جو حقوق نسواں کے مختلف شعبوں سے نمو پذیر ہوا ہے۔بنیادی طور پہ یہ عورت کی بغاوت نہیں بلکہ کھیت اور کھیتیوں کی اہمیت وافادیت کو عورت کی نظر سے دیکھنا ہے۔آمنہ مفتی کے ناولوں میں تباہ ہوتی ماحولیاتی قدروں اور اس کے ساتھ گم ہوتی تہذیب کی سنگینی کا بھرپور احساس نظر آتا ہے جو در حقیقت ایکو فیمینزم کے موضوعات ہیں۔

ج۔سفارشات:

۱۔ ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے آمنہ مفتی کے ناولوں کا دیگر معاصر ناولوں سے تقابل ہو سکتا ہے۔

۲۔ غیر افسانوی نثر میں ماحولیاتی تنقیدی عناصر کی نشاندہی اور تجزیہ بھی ایک اچھا تحقیقی موضوع ہو سکتا ہے۔

۳۔ آمنہ مفتی کے ناولوں پر موضوعاتی اور اسلوبی حوالے سے کام کرنے کی ضرورت بھی ہے۔

۴۔ آمنہ مفتی کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر پر مجموعی تحقیقی کام بھی کیا جا سکتا ہے تا کہ ایک تخلیق کار کی فکر تک یکجا سطح پر رسائی حاصل ہو سکے۔

۵۔ آمنہ مفتی کے ناولوں میں معاشرتی عکاسی کے حوالے سے تحقیقی کام ممکن ہے۔

کتابیات

الف۔ بنیادی ماخذ:

آمنہ مفتی، جرات رندانہ، الفیصل پبلیشر، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۷ء

آمنہ مفتی، آخری زمانہ، الفیصل پبلیشر، لاہور، پاکستان، ۲۰۱۰ء

آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفیصل پبلیشر، لاہور پاکستان، ۲۰۱۸ء

ثانوی ماخذ:

اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، ناول اور ناول نگار، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۷ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

انیس ہارون، "فیمینزم اور پاکستانی زیورات" مشمولہ فیمینزم اور ہم: ادب کی گواہی، ادارت فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، پاکستان، ۲۰۰۵ء

اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر، ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۹ء

جاوید اختر، ڈاکٹر، اردو کی ناول نگار خواتین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

حجاب امتیاز، مصنف کا نوٹ، مشمولہ پاگل خانہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

سنت راجندر سنگھ جی مہاراج، روح کی ماحولیات اور مثبت تصوف، سوئیوان کرپال پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۲ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اردو تنقید (اصول و نظریات)، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۷ء

شازلی حسن خان، ڈاکٹر، ماحولیاتی سائنس، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، س۔ن

شان الحق حقی، (مرتبہ)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اول، ۱۹۹۵ء۔

شمس الحق، ماحولیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ہندوستان، ۲۰۰۳ء۔

شہناز نبی، ڈاکٹر، فیمینزم- تاریخ و تنقید، رہروان ادب پبلی کیشنز، کولکتہ، ہندوستان

عبدالسلام، ڈاکٹر، فن ناول نگاری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۹۹ء

گوپی چند نارنگ، پروفیسر، "اردو افسانہ روایت اور مسائل"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، سائنس نامہ (سائنسی مضامین)، امان پبلیشرز، حیدرآباد، مارچ ۲۰۱۴ء

محمد اشرف، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء

محمد بن عیسی، سنن ترمذی، اشرفی بک ڈپو دیوبند، ہندوستان، س۔ن

محمد بن عیسی، سنن ترمذی، مکتبہ اشرفیہ دیوبند، س۔ن

محمد جہانگیر حیدر قاسمی، اسلام اور ماحولیات، "العالم" اردو کمپیوٹر سنٹر۔ حیدر آباد، ہندوستان، ۲۰۰۸ء

مکین احسن کلیم، سائنسی و فنی ڈکشنری، اردو سائنس بورڈ، لاہور، پاکستان، طبع ششم، ۲۰۱۷ء

ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۳ء

ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۷ء

نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

نشتر، محمد اسلام، کشاف سائنسی و تکنیکی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۳ء

رسائل:

بنیاد (سالنامہ) لمز لاہور، جلد ۱۰، جولائی ۲۰۱۹ء

دیدبان نئی دہلی، شمارہ سوم، جنوری ۲۰۱۸ء

انگریزی کتب:

A. R .Agwan, Islam and Environment ,IOS, Ist ed,India,1997.

Catrin Gersdrof and Sylvia Mayer, Nature in literary and cultural studies Transatlantic conversations on Ecocriticism, Amsterdam-New York, Ny 2006.

Cheryll Glotfelty & Harold Fromm, The Ecocriticism Reader: Landmarks in Literary Ecology, The University of Georgia press Athens and London,1996.

Joseph W.Meeker,The Comedy of Survival:Studies in Literary Ecology , Charles:Scribner;Ist Edition,1974.

Ken Hiltner, Ecocriticism: The Essential Reader, Routledge CRC Press, New York, 2015.

Kyle Bladow and Jennifer Ladino, Affective Ecocriticis: Emotion, Embodiment, Environment , University of Nebraska press Lincoln and London,2018.

Simon C. Estok, Shakespeare and Ecocriticism: An Analysis of Home and Power in King Lear, AUMLA, 2005.

ویب گاہیں(انٹرنیٹ):

https://or.wikipedia.org/wiki/22 March 2020

https://www.aikrozan.com.pk/29 May, 2020

https://www.humsub.com.pk/20 April, 2016

https://www.dawnnews.tv/news/17 December 2019

https://www.britannica.com/ 14 March 2021

مقالہ جات:

ہادی رضا، قانون اسلامی میں ماحولیاتی تحفظ، غیر مطبوعہ، مقالہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ہندوستان، 2017ء

(بذریعہ وائس) انٹرویو:

آمنہ مفتی کو بھیجا گیا، سوالنامہ جس کا جواب انھوں نے بذریعہ وائس نوٹس مہیا کیا، 18 ستمبر 2020ء، بروز جمعہ

ضمیمہ:

انٹرویو:

سوال: کیا آپ کا اصل نام اور قلمی نام ایک ہی ہے؟

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

سوال: آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق کہاں سے تھا؟

سوال: آپ کے والدین کا کیا نام ہے؟ اور وہ کیا کرتے تھے؟

سوال: آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟ وہ کن شعبوں سے وابستہ ہیں؟

سوال: آپ کا تعلیمی سفر کن کن راہوں اور منزلوں سے گزر کر کہاں تک پہنچا؟

سوال: آپ کی ازدواجی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

سوال: آپ کے بچے کتنے ہیں؟ اور وہ کیا کیا کرتے ہیں؟

سوال: آپ نے لکھنے کا آغاز کب کیا؟

سوال: آپ کا بچپن کیسا تھا؟ بچپن کا کوئی واقعہ جس سے آپ کے ادبی رجحان کا پتا چلتا ہو؟

سوال: اپنی تعلیم کے دوران کے اور ادبی دنیا کے یادگار واقعات بھی بتائیں؟

سوال: کیا آپ اپنی عادات واطوار کے بارے میں تفصیل سے بتانا چاہیں گی؟

سوال: آپ کی مصروفیات اور مشاغل کیا ہیں؟

سوال: آپ سماجی، ادبی، سیاسی، مذہبی اقدار کے بارے میں کیا تنقیدی نگاہ رکھتی ہیں؟

سوال: علم و ادب کے فروغ کے لیے آپ کی کیا کاوشیں ہیں؟

سوال: آپ کے استاد کون تھے؟ جو آپ کی رہنمائی کرتے تھے؟

سوال: آغاز میں آپ بطور اصلاح اپنا لکھا کس کو دیکھاتی تھیں؟

سوال: آپ نے اپنے لکھنے کا آغاز شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، افسانہ یا کالم میں سے کس سے کیا تھا؟

سوال: آپ کی اب تک کتنی اور کون کون سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں؟

سوال: آپ نے اب تک کتنے افسانے لکھے ہیں؟ اور وہ کہاں کہاں چھپ چکے ہیں؟

سوال: آپ کے کتنے ڈرامے ہیں؟ اور زیادہ تر آپ کن موضوعات پر لکھتی ہیں؟

سوال: آپ کے کالم کہاں کہاں چھپتے ہیں؟ اور ان میں زیادہ تر کن موضوعات کو ترجیح دیتی ہیں؟

سوال: آپ استاد بھی ہیں۔ بطور استاد آپ نے کب، کہاں اور کیا، کیا پڑھایا ہے؟

سوال: ادب میں آپ ناول، ڈرامہ، افسانہ میں کس کے اسلوب سے متاثر ہیں؟

سوال: زندگی میں آنے والے نشیب و فراز نے آپ پر کیا اثرات ڈالے؟

سوال: علمی و ادبی دنیا میں آپ کو کس طرح کی مشکلات کا سامنا رہا؟

سوال: آپ نے کن کن علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ مل کر کام کیا ہے؟

سوال: آپ نے شاعری میں کس صنف کو زیادہ اہمیت دی اور آپ نے کن اصناف میں کام کیا؟

سوال: آپ کو علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں اب تک کتنے اور کون کون سے ایوارڈ مل چکے ہیں؟

سوال: آپ کا کام کن کن رسالوں، چینلز اور اخباروں میں چھپ / نشر ہو رہا ہے؟

سوال: آپ کے خیال میں آپ اچھی ڈرامہ نگار ہیں یا ناول نگار؟

سوال: آپ نے ادبی دنیا میں آغاز شاعری سے کیا پھر چھوڑ دی اس کی کوئی وجہ؟